الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

برداشت ایک ایسی طاقتور ڈھال ہے
جس کے اوپر آپ
دشمن کے ہر حملہ کو روک سکتے ہیں

اگست ۱۹۹۱ ▫ شمارہ ۱۷۷ ▫ ۵ روپیہ

عظمتِ صحابہ

الرسالہ ستمبر ۱۹۹۱ کا شمارہ انشاء اللہ خصوصی شمارہ ہوگا۔ وہ "عظمتِ صحابہ" نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ صاحبان ایجنسی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیں تو پیشگی طور پر مطلع فرمائیں۔

(قیمت ۵ روپیہ)

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 ELSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US$ 25 (Air Mail)

ایک سنّت

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ مفسرین نے اس واقعہ کو معوذتین کی تشریح کے تحت تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک شخص لبید بن اعصم نام کا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک ماہر جادوگر تھا۔ سنہ ۷ھ میں خیبر کے کچھ یہودیوں نے اس آدمی کو تین سنہری سکہ دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی طاقت ور جادو کرے۔ اس شخص نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال اور آپ کی کنگھی کے کچھ دندانے حاصل کیے۔ اس پر اس نے جادو کا عمل کیا اور اس کو ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں لپیٹ کر بنو زریق کے کنویں کی تہ میں رکھ دیا۔ اس کنویں کا نام ذروان تھا۔ یہ سارا معاملہ اس نے نہایت راز داری کے ساتھ کیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر چند دن تک اس جادو کے کچھ اثرات رہے۔ آپ کو اس سے شدید تکلیف بھی محسوس ہوئی۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ اس کے بعد فرشتہ نے آکر آپ کو پورے معاملہ کی خبر کر دی۔ آپ نے مذکورہ کنویں میں سے جادو کا سامان نکلوایا اور اس کو ضائع کر دیا۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تعلیم کی کہ آپ قرآن کی دو سورہ (معوذتین) پڑھا کریں۔ اس سے آپ اس قسم کے تمام فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس فتنہ کا استیصال کرنے پر اکتفا فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اس کا عمومی تذکرہ نہیں کیا۔ کیوں کہ اندیشہ تھا کہ اگر اس شرارت کو عام مسلمانوں نے جان لیا تو وہ لبید بن اعصم کے ساتھ نہایت برا معاملہ کریں گے۔ راوی کہتے ہیں:

فقلتُ افلا تنشّرتَ۔ فقال اما اللّٰہ فقد شفانی واکرہ ان اُثیر علی احد من الناس شرًا (اخرجہ البخاری ورواہ مسلم واحمد بمثلہ)

میں نے کہا کہ آپ نے اس بات کا چرچا کیوں نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جہاں تک جادو کا تعلق ہے تو اللہ نے مجھے اس سے شفا دے دی اور میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں سے کسی شخص کے خلاف شر بھڑکاؤں۔

مومن کی دلچسپی مسئلہ کو ختم کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ مسئلہ پیدا کرنے والے شخص کو بدنام کرنے سے۔

امامت کا مسئلہ

ایک صاحب اپنی بستی کی مسجد کے امام کے خلاف زبردست مہم چلائے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ امام بدعتی ہے، اس لیے اس کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ وہ صاحب اپنی تمام کوشش کے باوجود امام کو مسجد سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے جو ہوا وہ صرف یہ تھا کہ بستی کے مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بستی میں مسجد کی رحمتیں اور برکتیں تو نہیں پھیلیں، البتہ پوری بستی نفرت اور اختلاف اور تشدد کا اکھاڑا بن گئی۔ ایک مثبت عمل منفی نتیجہ پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ یہ مسئلہ کیوں کھڑا کیے ہوئے ہیں کہ امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ صلّوا خلف کل بر وفاجر (ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھو) میں نے کہا کہ امامت تنظیم کے لیے ہوتی ہے۔ ورنہ نماز کا تعلق آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ جیسی آپ کی نیت ہوگی ویسی آپ کی نماز ہوگی۔ آپ کو چاہیے کہ اپنے اخلاص کو ٹٹولیں نہ کہ امام کی برائیوں کو۔

انھوں نے کہا کہ آپ عالم ہو کر غلط مسئلہ بتا رہے ہیں۔ جو حدیث آپ نے بتائی، اس میں فاجر کے پیچھے نماز پڑھنے کی اجازت ہے، مگر بدعتی کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ کیونکہ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ دوسری حدیث میں ہے کہ لا تصلوا خلف محدث (بدعتی شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھو)

میں نے کہا کہ کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے الفاظ جاننا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ تفقہ بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسری روایت میں محدث (بدعتی) کے پیچھے نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ انتخاب (choice) محدث اور متبعِ سنت کے درمیان ہو۔ مگر آپ کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ کے لیے محدث اور متبعِ سنت کے درمیان انتخاب کا موقع نہ تھا، بلکہ آپ کو محدِث امام اور مسلمانوں کے باہمی جدال و قتال کے درمیان انتخاب کرنا تھا۔ اور جب حالات کی نوعیت یہ ہو تو محدِث امام کو برداشت کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کو باہمی اختلاف کے شدید تر فتنہ سے بچایا جا سکے۔

اسلام ایک نتیجہ رخی (result oriented) مذہب ہے۔ اسلام میں آخری حد تک نتیجہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسلام میں صرف وہی اقدام جائز ہے جو بہتر نتیجہ تک پہنچانے والا ہو۔ بہتر نتیجہ پیدا کرنے والا اقدام جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری یہ ہے کہ برا نتیجہ پیدا کرنے والے اقدام سے اپنے آپ کو باز رکھا جائے۔

انسان درکار ہیں

ستمبر ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ ایک بیرونی سفر کے دوران میری ملاقات کچھ عرب نوجوانوں سے ہوئی۔ مجلس میں الجزائر کے ایک نوجوان تھے۔ وہ پہلے اخوانی طرز فکر سے متاثر تھے۔ اس کے بعد انھوں نے راقم الحروف کی تحریریں پڑھیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ آپ کی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر میری سمجھ میں اب تک یہ نہ آسکا کہ آپ کا عملی پروگرام کیا ہے۔

مذکورہ نوجوان کی بات سن کر میں نے کہا: برنامجنا هو اعداد المبرمجین (ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پروگرام بنانے والے انسان تیار کریں)، الرسالہ فروری ۱۹۹۰، صفحہ ۴۰

موجودہ زمانہ اسلام کے احیاء کا زمانہ ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اسلام کو دوبارہ ایک زندہ اور غالب طاقت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اس احساس کے تحت موجودہ زمانہ میں سیکڑوں بڑے بڑے رہنما اٹھے۔ ہر ایک کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے ہر ایک کی کوششیں صفر ہو کر رہ گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے "عملی پروگرام" سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ مگر عملی پروگرام سے کام کا آغاز کرنا ایسا ہی ہے جیسے باغ لگانے کا آغاز پھل کاٹنے سے کیا جائے۔

اسلام کا احیاء ایک بے حد سنجیدہ اور بے حد دور رس کام ہے۔ یہ کام دھواں دھار جلسوں اور پُر شور اقدامات کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے سب سے پہلے افراد کار مطلوب ہیں۔ اس کے لیے ایسے باشعور افراد کی ضرورت ہے جو خود اپنی ذات میں پروگرام ساز ہوں۔ جو اپنے حالات کو سمجھ کر خود کام کا منصوبہ بنائیں۔ جب تک ایسے افراد تیار نہ ہو جائیں، عملی پروگرام یا عملی اقدام کی حیثیت بے فائدہ چھلانگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

سطحی لوگ مظاہرہ کو کام سمجھتے ہیں۔ اس لیے جب بھی کوئی شخص مظاہراتی ہنگامے کرتا ہے تو لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کام کر رہا ہے۔ حالانکہ اس قسم کا کام بے فائدہ اچھل کود ہے۔ اس کا کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ زندگی میں اصل اہمیت افراد کی ہوتی ہے۔ اس لیے اصل کام یہ ہے کہ افراد تیار کیے جائیں۔ اسلام کے احیاء کا کام اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی لگے بندھے پروگرام کے ذریعہ انجام پا سکے۔ اس کے لیے ایسے ذہن درکار ہیں جو خود اپنی ذات میں پروگرام ساز ہوں، جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ حالات کے مطابق خود صحیح فیصلہ لیں اور اس کو بروئے کار لانے کی تدبیر اختیار کریں۔

حسد، اعتراف

حضرت یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں نے ابتدا میں یہ کیا کہ آپ کو کنویں میں ڈال دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ کو مصر کے اعلیٰ سیاسی عہدہ پر پہنچا دیا گیا۔ آپ کے بھائی پہلے اس معاملہ سے بے خبر تھے۔ مگر جب ان پر حقیقت کھلی تو وہ کہہ پڑے : تاللہ لقد آثرك اللہ علینا (خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہمارے اوپر فضیلت دے دی) یوسف ۹۱

اس کے برعکس مثال بنی اسرائیل کی ہے۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دو بھائیوں کی اولاد تھے۔ ابتداءً زیادہ تر پیغمبر بنی اسرائیل میں آئے۔ مگر آخری پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بنی اسماعیل میں پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل آپ کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے آپ کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا (النساء ۵۴)

یہ دو مختلف مثالیں ہیں۔ پہلی مثال اعتراف کی مثال ہے اور دوسری مثال انکار اور حسد کی مثال۔ یہی اس دنیا میں سب سے بڑا امتحان ہے، اور یہ امتحان آغاز حیات سے لے کر قیامت تک جاری رہے گا، یہاں تک کہ خدا ظاہر ہو کر تمام حقیقتوں کا آخری اعلان کر دے، اور اس کے بعد کسی کے لیے انکار اور حسد کا موقع ہی باقی نہ رہے۔

یہ امتحان سب سے پہلے آدم کی پیدائش کے وقت ہوا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اور ابلیس کو آدم کے آگے جھکنے کا حکم دیا۔ اس وقت فرشتوں نے اعتراف کا طریقہ اختیار کیا اور ابلیس نے حسد اور انکار کا۔ اس کے بعد یہی معاملہ آدم کے بیٹے ہابیل اور قابیل کی زندگی میں پیش آیا۔ ہابیل کی قربانی اللہ نے قبول کی اور قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ہابیل نے عجز اور اعتراف کا انداز اختیار کیا اور قابیل حسد اور انکار کا طریقہ اختیار کر کے خسران میں پڑ گیا (المائدہ ۳۰)

اس دنیا میں جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے، ہر ایک کو اس امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے کسی نہ کسی اعتبار سے یہ صورت حال آتی ہے کہ اس کے لیے ایک روش اعتراف کی ہوتی ہے اور دوسری روش حسد اور انکار کی۔ جو لوگ اعتراف کا طریقہ اختیار کریں وہ امتحان میں پورے اترے۔ اور جو لوگ حسد اور انکار کا طریقہ اختیار کریں وہ امتحان میں ناکام ہو گئے۔ اعتراف نہ کرنا خدا کے فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہے، اور اس سے بڑا مجرم کون ہے جو خدا کے فیصلہ پر راضی نہ ہو۔

دورِ اوّل کا طریقہ

قرآن میں حضرت مریم کے بارہ میں اُخت ہارون (مریم ۲۸) کا لفظ آیا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں :

قال کعب الاحبار بحضرة عائشة رضی الله عنها۔ ان مریم لیست باخت هارون اخی موسیٰ۔ فقالت له عائشة کذبت۔ فقال لها یا ام المومنین، ان کان رسول الله صلی الله علیه وسلم قاله فهو اصدق و اخبر۔ والا فانی اجد بینهما من المدة ستمأة سنة۔ قال فسکتت۔

حضرت کعب نے حضرت عائشہ کی موجودگی میں کہا کہ مریم، موسیٰ کے بھائی ہارون کی بہن نہ تھیں۔ عائشہ نے ان سے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ انھوں نے عائشہ سے کہا کہ اے ام المومنین، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا ہو تو وہ سب سے زیادہ سچے اور سب سے زیادہ باخبر تھے۔ ورنہ میں مریم اور ہارون کے درمیان چھ سو سال کا فرق پاتا ہوں۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۱/۱۰۰)

اس واقعہ پر غور کیجئے۔ حضرت عائشہ ایک جلیل القدر صحابی پر تنقید کرتی ہیں اور تنقید میں نہایت سخت لفظ استعمال کرتی ہیں۔ مگر صحابی نہ ان کی تنقید پر غصہ ہوتے اور نہ ان کے سخت لفظ پر انھیں ملامت کرتے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تاریخ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ اب آپ اگر کسی زیادہ طاقت ور دلیل (مثلاً قول رسول) سے میری بات رد کر دیں تو میں اپنی رائے سے رجوع کر لوں گا۔ حضرت عائشہ حضرت کعب کی بات کے وزن کو محسوس کرتی ہیں اور فوراً خاموش ہو جاتی ہیں (اس سلسلہ میں حضرت کعب کی تائید میں ایک قول رسول موجود ہے۔ مگر اس وقت غالباً دونوں میں سے کسی کو اس کا علم نہ تھا)

اسلام کے دور اول میں تنقید کا عام رواج تھا۔ لوگ سخت زبان میں تنقید کرتے تھے، تب بھی اس کو برا نہیں مانا جاتا تھا۔ اس زمانہ کا طریقہ یہ تھا کہ تنقید کو سن کر غصہ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ دیکھتے تھے کہ کہنے والے نے کیا بات کہی ہے۔ اور یہ کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط۔ اسی طریقہ میں دورِ اول کے لوگوں نے خیر کو پایا تھا، اور موجودہ زمانہ کے لوگ بھی اسی طریقہ میں خیر کو پا سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ خیر کو پانے کا نہیں۔

فرضی خطرہ

قدیم مکہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا:

إنا لنعلم ان الذي تقول حق۔ ولكنا ان اتبعناك خفنا ان تخرجنا العرب من ارض مكة (التفسير المظهري)

ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کا اتباع کریں تو ہم کو ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا (وقالوا ان نتبع الهدى معك نتخطف من ارضنا (القصص ۵۷)

مکہ کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ یہ تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت انھوں نے کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ اس طرح انھیں تمام قبائل عرب کی سرداری حاصل ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لیے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے مکہ والوں کو ملتے تھے۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں تو وہ اچانک تمام قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔

ٹھیک یہی صورت موجودہ زمانہ میں ہندستانی مسلمانوں کی ہے۔ ان کے سامنے قرآن کی بات رکھی جائے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کے مطابق یہی صحیح بات ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں —— اگر ہم صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ اگر ہم سیاسی شور وغل نہ کریں تو ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے ہم کٹ جائیں گے، اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ

اس قسم کی تمام باتیں بلاشبہ شیطانی وسوسہ ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

دو گروہ

جنت خدا کے نیک بندوں کی رہائش گاہ ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کے دو بڑے طبقے ہوں گے۔ ایک، السابقون (سبقت کرنے والے) اور دوسرے، اصحاب الیمین (دائیں طرف والے) پہلے گروہ کے لیے آخرت میں شاہانہ انعامات ہیں، اور دوسرے گروہ کے لیے عام انعامات (الواقعہ، رکوع اول)

درجہ اول اور درجہ دوم میں، یہ فرق کس بنیاد پر ہوگا۔ قرآن کے مطابق، اس کی وجہ فتح (الحدید ۱۰) ہے۔ جو لوگ فتح سے پہلے کے دور میں حق کو مانیں اور اس کا ساتھ دیں وہ السابقون کا درجہ پائیں گے۔ اور جو لوگ فتح کے بعد کے دور میں حق کو قبول کریں اور اس کے ساتھی بنیں وہ اصحاب الیمین کے گروہ میں جگہ دیے جائیں گے۔ یہ محض زمانہ کا فرق نہیں بلکہ نوعیت کا فرق ہے۔ اور نوعیت ایمان کا یہی فرق دونوں گروہوں کے انجام میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔

حق جب ظاہر ہوتا ہے تو ابتداءً وہ مجرد صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی نظری حقیقت کی ہوتی ہے جس کی پشت پر دلائل کی طاقت کے سوا کوئی اور طاقت موجود نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں جب حق کی دعوت فتح و غلبہ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو اس وقت حق کی حیثیت صرف عقلی صداقت کی نہیں ہوتی بلکہ اب اس کی حیثیت مرئی واقعہ کی بن جاتی ہے۔ اب ہر آنکھ والے کو وہ ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔

پہلے دور میں حق کو لفظی دلیل سے پہچاننا پڑتا تھا، دوسرے دور میں اس کی اہمیت کو منوانے کے لیے کھلے ہوئے واقعات موجود ہوتے ہیں۔ پہلے دور میں حق کو مانتے ہی آدمی اپنے ماحول کے اندر اجنبی بن جاتا تھا، دوسرے دور میں حق کے ساتھ وابستہ ہونا آدمی کو عزت اور مقبولیت کا مقام دے دیتا ہے۔ پہلے دور میں حق کا ساتھ دینے والا صرف کھوتا تھا، دوسرے دور میں حق کا ساتھ مزید پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ پہلے دور میں بنیاد کے نیچے دفن ہونا پڑتا تھا، دوسرے دور میں گنبد کی بلندیاں مل جاتی ہیں جن کے اوپر آدمی کھڑا ہو سکے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر پہلے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ اول کا مقام ہے اور دوسرے مرحلہ میں حق کا ساتھ دینے والے کے لیے درجۂ ثانی کا مقام۔

ایک تقابل

پرنسپل نرنجن سنگھ (۱۸۹۳-۱۹۷۸ ، ایس سی) ماسٹر تارا سنگھ کے بھائی تھے۔ (وہ نئی دہلی (ایسٹ پٹیل نگر) میں رہتے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۳ کو ان سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۳۱ اگست ۱۹۷۳) میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کا ایک جزء یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

امرتسر میں ۱۹۱۹ میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ پرنسپل نرنجن سنگھ اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس اجلاس میں بال گنگا دھر تلک، موتی لال نہرو، اینی بسنٹ اور دوسرے بڑے بڑے قومی لیڈر موجود تھے۔ مہاتما گاندھی بھی اگرچہ اس اجلاس میں شریک تھے۔ مگر بظاہر وہ اتنے غیر اہم دکھائی دیتے تھے کہ اسکول کے لڑکوں نے جب دوسرے شاندار لیڈروں کے ساتھ انھیں اسٹیج پر بیٹھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ گھاس کاٹنے والا کہاں سے آگیا۔

تلک نے اس اجلاس میں کامل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا۔ دوسرا رزولیوشن گاندھی جی کا تھا۔ اس میں ڈومینین اسٹیٹس کی تجویز رکھی گئی تھی۔ دونوں کی تقریروں کے بعد ووٹنگ ہوئی تو گاندھی جی کو ۱۷۲ ووٹ اور تلک کو ۱۲۳ ووٹ ملے۔ گاندھی جی کا رزولیوشن کثرت رائے سے منظور ہوگیا۔

پرنسپل نرنجن سنگھ نے یہ قصہ بتانے کے بعد کہا کہ تلک کے مقابلہ میں گاندھی جی کی یہ جیت اس وقت بڑی حیرت ناک تھی۔ اسٹیج سے جب نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو لڑکوں نے دوبارہ نعرہ لگایا: وہ گھسیارہ جیت گیا، وہ گھسیارہ جیت گیا۔

بال گنگا دھر تلک ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ بلند بانگ انداز (high-profile) میں بولتے تھے۔ گاندھی جی اس کے برعکس ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ دھیمے انداز (low-profile) میں کلام کرتے تھے۔ چنانچہ تلک (اور مسلمانوں کے اکثر لیڈر) پہلے ہی مرحلہ میں یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں سے کامل آزادی کی مانگ کریں۔ جب کہ گاندھی جی حالات کی رعایت کرتے ہوئے تدریجی انداز میں آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ابتدائی مرحلہ میں بہت سے لوگوں کو تلک جیسے افراد عظیم معلوم ہوتے تھے اور گاندھی بظاہر حقیر دکھائی دیتے تھے۔ مگر جب تاریخ نے آخری فیصلہ کیا تو دنیا نے دیکھا کہ گاندھی قائد کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں اور تلک جیسے لوگوں کو صرف پچھلی صف میں جگہ ملی ہے۔

رد و قبول

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ ایک ہندستانی لڑکا ملک کے ایک گورنمنٹ کالج میں داخلہ کی درخواست دینے کے لیے گیا۔ اس کو جو ایڈمیشن فارم دیا گیا، اس میں دوسری باتوں کے علاوہ ریلیجن اور کاسٹ کا خانہ بھی موجود تھا۔ لڑکے نے فارم کے تمام خانے بھرے، مگر ریلیجن اور کاسٹ کا خانہ اس نے سادہ چھوڑ دیا۔ اس نے جب اپنا فارم دفتر میں دیا تو کاؤنٹر کلرک نے دیکھنے کے بعد اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی وجہ، کلرک کے الفاظ میں یہ تھی کہ اس کا فارم نامکمل (incomplete) ہے۔ خبر کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ــــــــ (ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۱۰)

لڑکے کی درخواست داخلہ کو رد کرنے کا یہ سبب بالکل ٹکنکل تھا، وہ کوئی حقیقی سبب نہ تھا۔ مگر موجودہ دنیا میں ہر روز یہی قصہ پیش آرہا ہے۔ یہاں روزانہ بے شمار لوگ صرف اس لیے رد کر دیے جاتے ہیں کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے "ٹکنکل" معیار پر پورے نہیں اترے تھے۔ اس دنیا میں رد و قبول کے فیصلے حقیقی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ صرف مصنوعی بنیاد پر تمام فیصلے کیے جارہے ہیں۔

یہ معیاری دنیا میں ایک غیر معیاری صورت حال ہے جو آج ہر طرف دکھائی دے رہی ہے۔ یہ خدا کے تخلیقی منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔ خدا صرف مصلحتِ امتحان کی بنا پر اس کو گوارا کر رہا ہے۔ جیسے ہی خدا کی مقرر کی ہوئی مدتِ امتحان پوری ہوگی، خدا اچانک سارے نقشہ کو بدل دے گا۔ اس کے بعد خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ یہ عدالت تمام لوگوں کے بارہ میں حقیقی بنیادوں پر فیصلے کرے گی۔

جس طرح آج کوئی رد کیا جارہا ہے اور کوئی قبول کیا جارہا ہے۔ اسی طرح آخرت میں کوئی قبول کیا جائے گا اور کسی کو رد کر دیا جائے گا۔ مگر فرق یہ ہے کہ آج کا فیصلہ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی معیار پر کیا جارہا ہے، اور آخرت کا فیصلہ خدا کے مقرر کیے ہوئے حقیقی معیار پر ہوگا۔

اس وقت کتنے لوگ جن کو "داخلہ" دے دیا گیا تھا، وہ نکال کر باہر کر دیے جائیں گے۔ اور کتنے لوگ جو داخلہ سے محروم کر دیے گئے تھے، ان کی بابت حکم ہوگا کہ ان کے لیے ابدی رحمتوں کے دروازے کھول دو اور پھر کبھی ان کے اوپر انہیں بند نہ کرو۔

یہ دن بہر حال آنے والا ہے، اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

حقیقی عمل

میکسم گورکی (Maksim Gorky) ایک روسی ادیب ہے۔ وہ ۱۸۶۸ میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ایک جگہ بتایا ہے کہ محنت ہی کلچر کی بنیاد ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ ــــــ اگر ہر آدمی اپنی تھوڑی سی زمین میں پوری محنت کرے تو ہماری دنیا کتنی حسین ہو جائے۔

یہ بات صدفی صد درست ہے۔ ہر آدمی کے قریب اپنے عمل کا ایک ممکن دائرہ ہوتا ہے۔ اس کے اختیار میں ہوتا ہے کہ یہاں وہ اپنی پوری محنت صرف کرے اور اس کو آخری نتیجہ تک پہنچائے۔ اگر ہر آدمی اپنے اس ممکن دائرہ میں محنت کرنے لگے تو بیک وقت ساری دنیا میں بہت سے نتیجہ خیز عمل شروع ہو جائیں گے۔ اور جب یہ تمام عمل اپنے انجام کو پہنچیں گے تو تعمیر و ترقی کی ایک پوری دنیا ہر طرف کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی "تھوڑی زمین" پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی "بڑی زمین" کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ وہ خود اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بجائے یہ کرتا ہے کہ دوسروں کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے کہ وہ اپنی عملی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

اس قسم کا عمل انسانیت کو بربادیوں کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ جس سماج میں لوگ ایسا کریں وہاں لوگوں کے الفاظ سے تو ساری فضا گونج رہی ہوگی۔ مگر عمل کا سارا میدان صحرا کی طرح بے فصل پڑا رہے گا۔

ایک ایک کے مجموعہ ہی کا نام بڑی گنتی ہے۔ اجزاء کے جمع ہونے سے ہی ایک کل بنتا ہے۔ اس لیے اشخاص کا انفرادی طور پر عمل کرنا، نتیجہ کے اعتبار سے، سب کا عمل کرنا ہے۔ انفرادی سرگرمی اپنے انجام کے لحاظ سے اجتماعی سرگرمی ہے۔

جزء پر عمل کی بات کرنا پروگرام ہے، کُل پر عمل کی بات کرنا صرف نعرہ ہے۔ کیوں کہ جزء اپنے قبضہ میں ہوتا ہے۔ جزء پر محنت کرنا ہر شخص کے لیے ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کُل وہ چیز ہے جو کسی آدمی کے قبضہ میں نہیں۔ کل پر محنت کرنا عملی طور پر ممکن نہیں۔ پروگرام وہ ہے جو ممکن ہو۔ جو ممکن نہیں وہ پروگرام بھی نہیں۔

غور کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کی تو ان کی ایک تعداد آپ کی مخالف ہوگئی۔ لوگ آپ پر طرح طرح کے عیب لگانے لگے۔ اس سلسلہ میں جواب دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا :

کہو، میں تم لوگوں کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک۔ پھر سوچو کہ تمہارے ساتھی (پیغمبر) کو جنون نہیں ہے۔ وہ تو بس ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو ڈرانے والا ہے۔ کہو کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی ہے۔ میرا معاوضہ تو بس اللہ کے اوپر ہے۔ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے (سبا ۴۶۔ ۴۷)

مطلب یہ کہ تم جو اس دعوت کا انکار کر رہے ہو اور اس کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہو، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے جو چیز ہے وہ صرف ضد اور تعصب ہے۔ اگر تم لوگ ضد اور تعصب سے خالی ہو کر سوچو، خواہ اکیلے اکیلے انفرادی طور پر سوچو، یا کئی آدمی مل کر اجتماعی طور پر غور کرو تو تمہاری غلطی خود تمہارے اوپر واضح ہو جائے گی۔ اگر تم نے واقعی طور پر کھلے ذہن سے سمجھنے کی کوشش کی تو تم پاؤ گے کہ جس شخص کو تم دیوانہ بتا رہے ہو، وہ دیوانہ نہیں، وہ خدا کا سچا داعی ہے۔

تم دیکھو گے کہ داعی حق کی سابقہ زندگی اس کی سنجیدگی کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کا دردمندانہ انداز تم کو بتائے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہی اس کے دل کی آواز ہے۔ اس کے کلام کا حکیمانہ اسلوب تم کو اس کی صحت کی گواہی دیتا ہوا نظر آئے گا۔ اس کا تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہ ہونا ظاہر کرے گا کہ اس نے اس کام کو صرف اللہ کی خاطر شروع کیا ہے نہ کہ کسی ذاتی مفاد کی خاطر۔

اگر تم غیر جانب دارانہ انداز میں غور کرو تو تم جان لو گے کہ اللہ کے داعی کی بے قراری جنون کی بے قراری نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جس خطرہ سے ڈرانے کے لیے اٹھا ہے، اس کو وہ خود اپنی آنکھوں سے آتا ہوا دیکھ رہا ہے۔

جو لوگ سنجیدہ ہوں، ان کے لیے یہ حقیقتیں آنکھ کھولنے والی ثابت ہوں گی۔ وہ داعی کو پہچان کر اس کے ساتھی بن جائیں گے۔ مگر جو لوگ حق کی دعوت اور اس کے داعی کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہوں، وہ ان حقائق کو دیکھ نہیں سکتے، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ واضح اور کھلے ہوئے کیوں نہ ہو۔

ایسا کیوں

عن ابی ھریرۃ قال : ان رجلا شتم ابا بکر، والنبی صلی اللہ علیہ وسلم جالس یتعجب ویتبسم، فلما اکثر رد علیہ بعض قولہ، فغضب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وقام، فلحقہ ابوبکر، وقال : یا رسول اللہ کان یشتمنی وانت جالس، فلما رددت علیہ بعض قولہ غضبت وقمت قال : کان معک ملک یرد علیہ، فلما رددت علیہ وقع الشیطان

(رواہ احمد)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر کو برا کہا (حضرت ابوبکر چپ رہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے، آپ تعجب کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ پھر جب اس شخص نے بہت زیادہ کہا تو حضرت ابوبکر نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آگیا۔ آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر چل کر آپ سے ملے اور کہا کہ اے خدا کے رسول وہ آدمی مجھ کو برا کہہ رہا تھا اور آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے (اور خوش تھے) لیکن جب میں نے اس کی بعض بات کا جواب دیا تو آپ غصہ ہو گئے اور وہاں سے اٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ (جب تم چپ تھے) تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کا جواب دے رہا تھا۔ مگر جب تم نے خود اس کی بات کا جواب دیا تو فرشتہ چلا گیا اور شیطان آگیا۔

ایک آدمی آپ کو برا کہے۔ اس کے جواب میں آپ بھی اس کو برا کہیں تو بات بڑھتی ہے۔ جس آدمی نے پہلے صرف ایک سخت لفظ کہا تھا۔ اس کے بعد وہ سب وشتم پر اتر آتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ آپ کا جواب نہ دینا اس کو ابتدائی حد پر روک دیتا ہے، اور آپ کا جواب دینا اس کو اس کی آخری حد پر پہنچا دیتا ہے۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ ایک شخص آپ کو برا کہے یا گالی دے مگر آپ خاموش ہو جائیں، آپ اشتعال انگیز کلام کے باوجود مشتعل نہ ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا لہجہ آہستہ آہستہ دھیما ہو رہا ہے۔ اس کے غبارے کی ہوا نکلنا شروع ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے وہ اپنے آپ چپ ہو جائے گا۔ آپ کا بولنا دوسرے کو مزید بولنے پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر آپ چپ ہو جائیں تو آپ کا

چپ ہونا آخر کار دوسرے شخص کو بھی چپ ہونے پر مجبور کر دے گا۔

دونوں صورتوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب برا کرنے والے کا جواب برائی سے دیا جائے تو اس کے اندر ردعمل کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اس کی انا کو جگائے۔ وہ اس کے غصہ کو بڑھا کر اس کو آخری درجہ تک پہنچا دے۔ وہ برائی جو اس کے اندر سوئی ہوئی تھی، وہ پوری طرح جاگ کر آپ کے بالمقابل کھڑی ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب برا کرنے والے کے ساتھ اعراض کا معاملہ کیا جائے تو اس کے اندر خود احتسابی کی نفسیات جاگتی ہے۔ اب فرشتہ کو موقع ملتا ہے کہ وہ آدمی کی فطرت کو بیدار کرے۔ وہ اس کے ضمیر کو متحرک کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس کے اندر شرمندگی کا جذبہ پیدا کرے۔ وہ اس کو اپنی اصلاح پر ابھارے۔

پہلی صورت میں آدمی شیطان کے زیر اثر چلا جاتا ہے اور دوسری صورت میں فرشتہ کے زیر اثر۔ ایک واقعہ کی صورت میں دوسرے کو ملزم ٹھہرا کر اس سے انتقام لینے کے جذبات بھڑکتے ہیں اور دوسرے واقعہ کی صورت میں اپنے کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنی اصلاح کرنے کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

ہر آدمی کے سینہ میں دو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک طاقت آپ کی موافق ہے جس کی نمائندہ آدمی کا ضمیر ہے۔ دوسری طاقت آپ کی مخالف ہے۔ اس کی نمائندہ آدمی کی انا ہے۔ اب یہ آپ کے اپنے اوپر ہے کہ آپ دونوں میں سے کس طاقت کو جگاتے ہیں۔ آپ اپنے قول وعمل سے جس طاقت کو جگائیں گے وہی آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک طاقت کو جگانے کی صورت میں فریق ثانی آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اور اگر آپ نے دوسری طاقت کو جگایا تو خود فریق ثانی کے اندر ایک ایسا عنصر نکل آئے گا جو آپ کی طرف سے عمل کر کے اس کو آپ کے مقابلہ میں مغلوب ومفتوح بنا دے۔

مذکورہ واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی پر غصہ نہیں ہوئے جو بدکلامی کر رہا تھا۔ مگر حضرت ابوبکر صدیق کی زبان سے برا کلمہ نکلا تو آپ غصہ ہو گئے۔ گدھے کے لیے شریعت میں اعراض کا اصول ہے اور انسان کے لیے امر بالمعروف کا اصول۔

صبر کا ہتھیار

۶ ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ مسز کلیش (۲۲ سال) شاہدرہ کی ایک سڑک پر چل رہی تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اچانک اشوک نامی ایک شخص جس کی عمر ۲۵ سال تھی جھپٹا اور مسز کلیش کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ پولیس کانسٹبل کشن چند تیاگی (۳۴ سال) اس وقت ڈیوٹی پر گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کو واقعہ کے بارہ میں بتایا۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک بالمیکی مندر میں پہنچے جہاں مجرم موجود تھا۔ پولیس کی وردی دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کشن چند نے اس کا پیچھا کیا۔ مجرم کے پاس ایک ریوالور تھا۔ اس نے فائر کیا تو اس کی گولی کشن چند کی آنکھ کے نیچے ان کے چہرہ اور گردن کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی۔ انھوں نے چلا کر کہا "ایک بار تو نے مجھے مار دیا۔ پر دوبارہ تو نہیں مار سکتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تیرے پاس ریوالور ہے" اب وہ چوکنا ہو گئے۔ مجرم نے دو بار اور گولی چلائی۔ مگر ہر بار وہ نہایت پھرتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس کے وار کو خالی کر دیا۔ کشن چند کسی خوف کے بغیر تنہا مجرم کا پیچھا کرتے رہے جب کہ "دشمن" کے پاس ریوالور تھا اور ان کے اپنے پاس لاٹھی بھی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے آخرکار ساڑھے چار فٹ کی ایک چہار دیواری سامنے آگئی۔ مجرم اس پر کود گیا۔ کشن چند نے بھی فوراً چھلانگ لگائی اور دوسری طرف جا کر اس کو پکڑ لیا۔

"ایک مسلح مجرم کو دوڑاتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا"۔ ایک اخبار نویس نے کشن چند سے پوچھا۔ "نہیں" انھوں نے جواب دیا۔ "میں جانتا تھا کہ جب اس کا ریوالور خالی ہو چکا ہوگا تو میں اس کو پکڑ لوں گا"۔ مجرم کے پاس تین گولی تھی۔ کشن چند نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی تینوں گولیاں خالی کرا دیں۔ اب مجرم کا ہتھیار ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ کشن چند نے اس کو پکڑ لیا (ہندستان ٹائمز، ۷ ستمبر ۱۹۸۰)

اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اکثر حالات میں حریف سے مقابلہ کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں اس کے وار کو خالی کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کے ہتھیار کی "تین گولی" ختم ہو جائے۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا نہایت آسان ہوگا۔ مثلاً ایک

شخص آپ سے طاقت ور ہے اور وہ آپ کی کسی بات پر برہم ہوجاتا ہے۔ جب وہ آپ کو ڈانٹنا اور بگڑنا شروع کرے تو ابتداءً آپ اس کے وار کو خالی کر دیں، یعنی بالکل چپ ہو کر اس کی بات کو سنتے رہیں، یہاں تک کہ جب اس کے الفاظ ختم ہوجائیں اور اس کی بھڑاس نکل جائے، اس وقت سنجیدگی کے ساتھ صورت حال کے بارہ میں اس کو بتائیں۔ اگر آپ ابتداء میں اس قسم کا صبر دکھائیں تو آپ یقیناً کامیاب رہیں گے۔ کیوں کہ اب وہ اپنے ہتھیار کی "تین گولیاں" ختم کر چکا ہے اور اب بہت آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ ہیں جو آپ کے خلاف متحد ہو کر آ گئے ہیں اور آپ کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ غور کیجئے تو یہ اتحاد صرف اس بنیاد پر ہوگا کہ آپ ان کے سامنے ان کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ حکمت عملی کا طریقہ اختیار کریں اور کچھ دیر کے لئے اپنے کو نشانہ سے ہٹا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا اتحاد ٹوٹ رہا ہے۔ ان کے اتحاد کے ہتھیار کی گولی آپ کا حریف بن کر کھڑا ہونا تھا۔ جب آپ نے اپنے کو حریف کے مقام سے ہٹا دیا تو گویا آپ نے ان کی "تینوں گولیاں" خالی کرا دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ منتشر ہوجائیں گے اور جو گروہ اختلاف اور انتشار میں پڑ جائے اس کو ختم کرنے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا گروہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو ختم کر لیتا ہے۔

کوئی حریف جب سامنے آتا ہے تو آدمی جوش میں آکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہ حریف کی طاقت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی صبر اور دانش مندی سے کام لے اور مقابلہ کے ابتدائی مرحلہ میں حریف کے وار کو خالی جانے دے تو بہت جلد ایسا ہوگا کہ حریف خود اپنی کارروائیوں کے نتیجہ میں اپنے کو غیر مسلح کر چکا ہوگا۔ یاد رکھئے، کوئی بھی شخص جو آپ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کے پاس ہمیشہ "تین" ہی گولیاں ہوتی ہیں۔ لاتعداد گولیاں کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ اگر آپ یہ ہوشیاری دکھائیں کہ مقابلہ کے آغاز میں کسی طرح اپنے کو نشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد یقینی طور پر ایسا ہوگا کہ دشمن اپنی "تین گولیوں" کو ختم کر کے خالی ہاتھ ہو چکا ہوگا۔ اب زیادہ بہتر طور پر وہ وقت آ جائے گا کہ آپ اس کو زیر کر سکیں۔ یہ کامیابی ہر ایک حریف کے اوپر حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ پیش

آنے کے بعد آدمی اپنے حواس کو نہ کھولے۔

خدا جلدی نہیں چاہتا

ایک شخص اپنے عیسائی دوست سے ملنے گیا۔ جب وہ دوست کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ "آج میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔" اس نے پوچھا۔ عیسائی دوست اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا:

I am in hurry, but God isn't

میں جلدی چاہتا ہوں۔ مگر خدا جلدی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے صحن میں ایک مرجھائے ہوئے آم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں نے اس کو بڑی امیدوں کے ساتھ پچھلے ہفتہ لگایا تھا۔ مگر اب وہ سوکھ کر ختم ہو چکا ہے۔

"یہ درخت تو کافی بڑا ہے، پھر ایک ہفتہ پہلے کیسے آپ نے اس کو لگایا تھا۔" آدمی نے پوچھا۔ "یہی تو اصل بات ہے" عیسائی دوست نے کہا "میں نے چاہا کہ میں اچانک ایک بڑا درخت اپنے یہاں کھڑا کر دوں۔ مگر خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے آم کا چھوٹا پودا بونے کے بجائے یہ چاہا کہ پانچ سال کا درخت لاکر اپنے صحن میں لگاؤں اور اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کرلوں۔ میں نے درخت تو کہیں نہ کہیں سے لاکر لگالیا۔ مگر وہ اگلے ہی دن سوکھ گیا۔ اور اب اس کی جو صورت ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

اس کے بعد عیسائی دوست نے کہا: اس دنیا میں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ ہم اس قانون کی پیروی کرکے ہی اس چیز کو اپنے لئے وجود میں لاسکتے ہیں۔ اگر ہم قدرت کے اصول کی پیروی نہ کریں اور اپنی خواہشوں پر چلنے لگیں تو ہمارے حصہ میں "سوکھا درخت" آئے گا نہ کہ "ہرا بھرا باغ"۔

لکڑی کی ایک کشتی کی تاریخ اگر چھوٹے پودے سے شروع کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کشتی والا انتظار کرتا ہے کہ قدرت ایک درخت اگائے۔ زمین و آسمان کے تمام انتظامات

اس کو پر وان چڑھانے کے لئے وقف ہوں۔ یہ کام سو برس تک ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلسل عمل کے نتیجہ میں ننھا پودا پختہ درخت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس وقت کشتی والا اس کو کاٹتا ہے۔ اس کے تختے بناتا ہے اور پھر ان تختوں کو لوہے کی کیلوں سے جوڑ کر وہ کشتی تیار کرتا ہے جو انسانی قافلوں کو پانی کے اوپر سفر کرنے کے قابل بنائے۔

ذاتی معاملات میں ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے۔ مگر جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ فی الفور ایک عظیم الشان کشتی دریا میں اتار دے۔ خواہ اس کے پاس کشتی کے نام سے کاغذ کی ناؤ ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رکھئے۔ یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اور وہ اسی خدا کے قانون کے تحت چل رہی ہے۔ ہم اس سے موافقت کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ساتھ موافقت نہ کریں تو ہمیں اس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔

جس طرح درخت تدریج کے ساتھ اگتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات بھی تدریج کے ساتھ درست ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے قدرت کے اس تدریجی قانون کو جانئے اور اس کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کیجئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقیہ تمام راستے کھڈ کی طرف جاتے ہیں نہ کہ کسی منزل کی طرف۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ صبر کا مطلب بے عملی نہیں، صبر دراصل منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے صبر آدمی فوری رد عمل کے تحت بے سوچے سمجھے کارروائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ قانون قدرت کو سمجھتا ہے جس کے دائرہ میں اس کو اپنا عمل کرنا ہے۔

اسی طرح سوچ بچار کے بعد عمل کا نقشہ بنانے کے لیے اپنے جذبات کو تھامنا پڑتا ہے، اس لیے اس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی کو منصوبہ بند عمل کہتے ہیں۔ اس دنیا میں صابرانہ عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور غیر صابرانہ عمل ہمیشہ ناکام۔

برتر حل

سوچنا (thinking) ہماری دنیا کا ایک ناقابل فہم حد تک عجیب عمل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان تحقیقات نے انسان کے علم میں اضافہ کرنے سے زیادہ انسان کی حیرانگی میں اضافہ کیا ہے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

Dr Rapaport, *Toward a Theory of Thinking*, 1951
W.E. Vinacke, *The Psychology of Thinking*, 1952
F.C. Bartlett, *Thinking*, 1958
Max Wertheimer, *Productive Thinking*, 1959

ان تحقیقات کے ذریعہ بے شمار نئی معلومات سامنے آئی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے اندر ہمیشہ ایک نہایت اہم عمل جاری رہتا ہے۔ علماء نفسیات اس کو ذہنی طوفان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ذہن کسی نئے چیلنج سے دوچار ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ خود اپنی فطرت کے زور پر مسائل کے نئے حل تلاش کرنے لگتا ہے۔ یہ عمل اس امکان کو بڑھا دیتا ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کچھ برتر حل آدمی کے سامنے آجائیں:

A process called brainstorming has been offered as a method of facilitating the production of new solutions to problems... These unrestricted suggestions increase the probability that at least some superior solutions will emerge (18/357).

یہ ریسرچ بتاتی ہے کہ آدمی جب کسی بحرانی حالت سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر چھپی ہوئی فطری صلاحیت کے تحت اس کے اندر ذہنی طوفان (brainstorming) کی ایک کیفیت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ طوفان اس کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ کا ایک برتر حل (Superior solution) دریافت کرلے۔ اور مسئلہ کا برتر حل معلوم ہو جانے کے بعد کامیابی اتنی ہی ممکن ہو جاتی ہے جتنا شام کے بعد صبح کا آنا۔

اللہ کا یہ معاملہ کیسا عجیب ہے کہ اس نے مشکلات کو ہماری ترقی کا زینہ بنا دیا۔ اس نے

اپنی قدرت خاص سے ہمارے نہیں کو ہمارے ہے ہیں تبدیل کر دیا۔

چیلنج کا جواب

انگریز مورخ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) نے عالمی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) لکھی جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ٹوائن بی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ چیلنج اور اس کا جواب (Challenge-response) میکانزم وہ چیز ہے جو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، خارجی چیلنج ہی وہ لازمی عمل ہے جو افراد یا قوموں کے امکانات کو جگا دیتا ہے۔ تہذیب کا ابتدائی اور بنیادی مرحلہ ماحول کے ایسے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے جو نہ اتنا سخت ہو کہ ترقی کو روک دے، نہ اتنا موافق ہو کر وہ تخلیقیت کو معطل کر دے۔ قوم کی ایک تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دیتی ہے اور قوم کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے:

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too serve to stifle progress nor too favourable to inhibit creativity, which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. (X/76).

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی مصیبتیں (troubles) لوگوں کی صلاحیتوں کو جگاتی ہیں بشرطیکہ وہ اتنی زیادہ نہ ہوں کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن سب سے زیادہ تخلیقی انسان ثابت ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ مومن کے اندر سہنے اور تاب لانے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

عام انسان صرف اپنے آپ میں عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ دوسری طرف مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ خدائے برتر میں عقیدہ رکھتا ہے اور خدا کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی قوتیں محدود ہیں، خدا کی قوتیں لامحدود۔ اس بنا پر عام انسان کے لئے کسی نہ کسی مقام پر حد آجاتی ہے۔ جب کہ مومن کے لئے کبھی حد نہیں آتی۔ جہاں

مومن کی اپنی حد ختم ہو جائے، وہاں اس کا خدا اس کی کمی کی تلافی کے لئے موجود ہوتا ہے۔
مومن دوسروں کے مقابلہ میں مصیبت اور مشکلات کو زیادہ برداشت کرسکتا ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ثابت ہوتا ہے۔

مصیبتیں کیوں آدمی کو تخلیقی بناتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبتیں انسان کے دماغ کے اجزاء (particles) کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کی خوابیدگی کو بیداری بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی کے اوپر مشکلات آتی ہیں تو اس کی سوچنے اور کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس واقعہ کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ عام انسان کے دماغ کے اجزاء صرف محدود طور پر جاگتے ہیں، جب کہ مومن کے دماغ کے اجزاء لامحدود طور پر جاگ اٹھتے ہیں۔ عام انسان کی تخلیقیت کی ایک حد ہے، مگر مومن کی تخلیقیت کی کوئی حد نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے (الطلاق ۳) ارشاد ہوا ہے کہ تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (المائدہ ۳) اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اللہ تمہارے اعمال درست کردے گا (الاحزاب ۷۰-۷۱)

اس قسم کی آیتوں کا مطالعہ کیجئے، اور پھر فطرت کے مذکورہ قانون کو سامنے رکھئے تو اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ اہل ایمان پر جب بھی مشکلات و مصائب کا لمحہ آئے تو اس وقت جو ضروری کام کرنا ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اعتماد علی اللہ کی کیفیت کو ابھارا جائے۔ اللہ پر توکل اور اعتماد ان کے اندر برداشت کا مادہ پیدا کرے گا۔ اور جن لوگوں کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی صفت ابھر آئے وہ مشکلات کے وقت ہیرو بن جاتے ہیں۔ وہ مشکلات کو اپنے لئے نفسیاتی ٹانک بنا لیتے ہیں۔

اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا بذات خود کوئی مسئلہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مشکل پیش آنے کے وقت آدمی اس کو سہارنے کی طاقت کھو دے۔ اس لئے مشکل پیش آنے کے وقت شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ کوشش کرنا چاہئے کہ آدمی کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی طاقت جاگ اٹھے۔ مشکل کے وقت آدمی اگر پست ہمت ہونے سے بچ

جائے تو اس کے بعد اس کا ذہن مزید طاقت کے ساتھ متحرک ہو کر اپنے آپ مسئلہ کو حل کرے گا۔

عسر کے ساتھ یسر

ایک بار کا واقعہ ہے۔ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک شاندار ہال میں کیا گیا تھا۔ بے ریش اور باریش مسلمانوں سے ہال کی کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اجتماع کا پروگرام قرأت سے شروع ہونے والا تھا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ کوئی قاری یا حافظ اجتماع میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے ایک استاد اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے پارہ عم سے دو سورتیں سادہ طور پر پڑھ کر سنائیں۔ سورہ والضحیٰ اور سورہ الم نشرح۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ ایک کے بعد ایک لوگ اسٹیج پر آنا شروع ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش تقریروں سے ہال گونجنے لگا۔ تمام تقریروں کا خلاصہ صرف ایک تھا ـــــ اسلام آج مخالفانہ سازشوں سے گھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے دشمن ان کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو آج ہر طرف تعصب، ظلم، سازش اور عناد کا سامنا ہے۔ اسی قسم کی باتوں پر اجتماع شروع ہوا اور اسی قسم کی باتوں پر آخر کار وہ ختم ہو گیا۔

آخر میں میں مائک پر آیا۔ میں نے کہا کہ آپ حضرات نے اغیار کے خلاف تقریریں کی ہیں، مگر مجھے خود آپ کے خلاف بولنا ہے۔ آپ کو دوسروں سے شکایت ہے، مجھے خود آپ سے شکایت ہے۔

آپ نے اپنا یہ اجتماع اگرچہ قرآن کی تلاوت سے شروع کیا۔ مگر یہ تلاوت محض رسمی تھی۔ بلکہ وہ قرآن کی نفی کے ہم معنی تھی۔ آپ لوگوں نے قرآن کو پڑھ کر قرآن کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

آپ نے اپنے اجتماع کے آغاز میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے تکرار کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے، مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے (فان مع العسر یسراً ۔ ان مع العسر یسرا)

قرآن کی اس آیت کے مطابق لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ موجودہ حالات میں اگر کچھ باتیں ہمارے خلاف ہوں، تو اسی کے ساتھ کچھ باتیں ہمارے موافق بھی ہوں۔ قرآن کے لفظوں میں، عسر کے ساتھ یسر بھی ہو۔ مگر آپ سب لوگوں نے صرف غیر موافق باتوں (عسر) کا اعلان کیا۔ آپ میں سے کسی نے موافق باتوں (یسر) کا انکشاف نہیں کیا۔ اس طرح آپ نے قرآن کے ایک جزء کا تو خوب ذکر کیا، مگر قرآن کے دوسرے جزء کو آپ نے یکسر حذف کر دیا۔

یہودی یا اور کوئی فرقہ اگر قرآن کا ایسا نسخہ چھاپے جس میں قرآن کی ایک آیت کو نکال دیا گیا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر خود مسلمان عملاً یہی کام کر رہے ہیں۔ آج ہر جگہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ "عسر" کے واقعات کا خوب چرچا کرتے ہیں، مگر وہ "یسر" کے پہلوؤں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

دوسرے لوگ اگر قرآن میں کمی بیشی کریں تو مسلمان اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر خود مسلمان یہی کام زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں تو اس کا غلط ہونا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

لوگ قرآن کی "تلاوت" کر رہے ہیں مگر وہ قرآن سے بے خبر ہیں۔ لوگ اپنے جلسوں کا آغاز قرآن سے کرتے ہیں، مگر وہ صرف رسمی تبرک کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے رہنمائی لینے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے چرچا کے باوجود قرآن کا فائدہ لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

قرآن بلاشبہ قوموں کو اٹھانے والی کتاب ہے۔ مگر قرآن کا یہ معجزہ اس قوم کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو قرآن کو اپنا رہنما بنالے نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو قرآن کے الفاظ خوش الحانی کے ساتھ دہرائیں اور اس کے بعد اس کو بند کرکے طاق پر رکھ دیں۔

مفتاح عظیم

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: المفتاح العظیم (عظیم کنجی) اس میں بتایا گیا تھا کہ دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ماضی میں اسلام نے دعوت کے ذریعہ عالمی فتح حاصل کی تھی۔ آج بھی ہم دعوت کے ذریعہ دوبارہ اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اسی پرچہ میں ایک اور چھ صفحات کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: الاقلیات المسلمة تواجه خطر الذوبان (مسلم اقلیتوں کو بھیڑیوں کے خطرہ کا سامنا) اس مضمون میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ دکھایا گیا تھا کہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اکثریتی فرقہ اور اکثریتی فرقہ کی حکومت ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کر رہی ہے، وہ ان کے ساتھ وحشی بھیڑیوں جیسا سلوک کر رہی ہے۔

یہ دونوں باتیں مذکورہ جریدہ کے ایک ہی شمارہ میں چھپی ہوئی تھیں، حالاں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ قومیں جن کو اس مضمون میں بھیڑیا (ذوبان) کہا گیا ہے، وہ کون ہیں۔ وہ وہی غیر مسلم قومیں ہیں جن کے اوپر ہمیں دعوت کا کام کرنا ہے۔ وہ ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گویا "مسلم اقلیتیں" داعی ہیں اور ان کی پڑوسی غیر مسلم اکثریتیں مدعو۔ اب اگر داعی کے دل میں یہ بٹھایا جائے کہ مدعو تمہارے لئے ظالم بھیڑیا ہے تو کیا وہ سچے داعیانہ جذبہ کے ساتھ اپنے مدعو کے اوپر دعوت کا عمل جاری کر سکتا ہے۔ کیا وہ انی لکم ناصح کی نفسیات کے ساتھ اس سے معاملہ کر سکتا ہے۔

دعوت سر تا سر محبت کا ایک عمل ہے۔ داعی کو آخر حد تک اپنے مدعو کی ہدایت کا حریص بننا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی دعوت کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ مدعو اگر زیادتی کرے تب بھی داعی اس کی زیادتیوں کو بھلا کر یک طرفہ طور پر اس کو اپنی دلچسپی کا موضوع بناتا ہے۔ وہ اپنے دل کو مدعو کی شکایات سے اتنا زیادہ خالی کرتا ہے کہ اس کے دل سے مدعو کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں۔

لوگ دعوت کی باتیں کرتے ہیں مگر وہ اس کے آداب نہیں جانتے۔ لوگ داعی کا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے تقاضے کو پورا کریں۔ لوگ شہادت علی الناس کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے اس کی قیمت ادا کی ہو۔

یہ صرف ان ملکوں کا معاملہ نہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ٹھیک یہی نفسیات ان ملکوں کے مسلمانوں کی بھی ہے جہاں انھیں اکثریت حاصل ہے یا جہاں پوری کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقلیتی علاقہ کے مسلمانوں کو مقامی غیر مسلم طاقت سے شکایت ہے۔ اور اکثریتی علاقہ کے مسلمانوں کو عالمی غیر مسلم طاقتوں سے۔ مثلاً یہودی، عیسائی، اشتراکی مستعمرین، مستشرقین وغیرہ۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کے مفاد کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ بذات خود کتنی ہی زیادہ سنگین اور کتنی زیادہ اہم کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس معاملہ میں اتنی واضح رہنمائی کرتی ہے کہ طالب حق کے لئے ادنیٰ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہجرت سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کے ساتھ حد درجہ توہین و تذلیل کا سلوک کیا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ حتی کہ آپ نے خود حضرت عائشہ سے فرمایا کہ طائف کے دن سے زیادہ سخت دن میرے اوپر کوئی اور نہیں گزرا۔ روایات بتاتی ہیں کہ جب آپ غم اور تکلیف کے ساتھ طائف سے واپس ہوئے تو راستہ میں اللہ کے حکم سے ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کی باتیں سنیں۔ میں ملک الجبال ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کے ذریعہ اس بستی کو کچل ڈالوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی اگلی نسلوں سے ایسا شخص پیدا کرے گا جو اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے (ارجو ان یُخرج اللہ من اصلابھم مَن یعبد اللہ لا یشرک بہ شیئاً۔ السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، المجلد الثانی، صفحہ ۱۵۲)

دعوت بلاشبہہ مفتاح عظیم ہے۔ مگر اس مفتاح عظیم کو استعمال کرنے کے لئے قلب عظیم درکار ہے۔ اس کے لئے وہ کردار مطلوب ہے جس کو قرآن میں بلند اخلاق (خُلق عظیم) کہا گیا ہے۔ قلب عظیم کے بغیر کوئی آدمی نہ تو دعوت کے امکانات کو جان سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر وہ اس قابل ہو سکتا کہ وہ ان امکانات کو استعمال کر سکے۔

اسلامی طریقہ

قرآن میں جن گھریلو مسائل کا ذکر ہے، ان میں سے ایک نشوز ہے۔ نشوز کا لفظی مطلب ہے سر اٹھانا۔ نشوز کا اظہار مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اس فعل کا ظہور مرد کے مقابلہ میں عورت کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب شوہر کی نافرمانی ہوتا ہے۔ اور اگر وہ عورت کے مقابلہ میں مرد کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شوہر اپنی بیوی کا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔

نشوز کی صورت پیش آنے کے بعد عورت اور مرد کے باہمی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو کیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ہدایت دی گئی کہ سب سے پہلے دونوں آپس میں بات چیت کے ذریعہ اصلاح کی کوشش کریں (النساء ۱۲۸)

اگر آپس کی بات چیت سے تعلقات درست نہ ہوں تو دوسرے مرحلہ میں یہ کرنا چاہیے کہ دونوں خاندانوں سے ایک ایک شخص کو بطور حکم مقرر کیا جائے۔ دونوں خیر خواہی کے انداز میں کوشش کر کے معاملہ کو داخلی سطح پر طے کرنے کی کوشش کریں (النساء ۳۴) اگر یہ دوسری کوشش بھی ناکام ہو جائے تو تیسرے مرحلہ میں معاملہ کو بیرونی عدالتی ادارہ (قضا) کے سپرد کر دیا جائے۔

اس تعلیم کا براہ راست تعلق شوہر اور بیوی کے نزاع سے ہے۔ مگر اس سے شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب دو انسان یا دو گروہ کے درمیان کوئی جھگڑے کی صورت پیدا ہو تو اس وقت جھگڑے کو حل کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس طریق عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاملہ کو محدود دائرہ میں رکھ کر اسے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اولاً یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جن چند آدمیوں کے درمیان مسئلہ پیدا ہوا ہے، انھیں کے درمیان اس کو باقی رکھا جائے اور اس کے دائرہ کو آخری حد تک محدود رکھتے ہوئے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اگر بالفرض ساری تدبیروں کے باوجود یہ ابتدائی کوشش ناکام ہو جائے تب بھی معاملہ کو پھیلایا نہ جائے۔ اس کے بعد بھی صرف قریبی افراد کو شریک کر کے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر قریبی اور متعلق افراد کی کوشش بھی اس کو حل کرنے میں ناکام ثابت ہو تو اس وقت جائز ہے کہ اس کو عدالت یا اور کسی خارجی ادارہ کے سپرد کیا جائے۔

قول سدید

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۰ - ۷۱)

اس آیت میں اہل ایمان کو قول سدید کا حکم دیا گیا ہے۔ قول سدید سے مراد ہے بالکل ٹھیک بات، عین مطابق واقعہ بات۔ ایسے کلام کا انجام یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تم کو اصلاح اعمال کا فائدہ ہوگا۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایک شخص کو دوسرے آدمی کے بارہ میں کوئی بیان دینا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی اگر وہی بات کہے جو فی الواقع ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کہنے والے کے اندر سنجیدہ مزاج بنے گا۔ نفسیاتی تضاد سے پاک شخصیت اس کے اندر پرورش پائے گی۔ اس کے سینہ کے اندر دوسروں کے بارہ میں خیرخواہی کے جذبات ابھریں گے۔ اور جب کہنے والے کا یہ حال ہوگا تو دوسرے لوگ بھی اس کا مثبت اثر لیں گے۔ اس طرح پورا سماج صحت مند سماج بن جائے گا۔ بغض، حسد، کینہ، انتقام، نفرت، عیب جوئی جیسی برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ حقیقت پسندی اور صدق بیانی کا ماحول ہر طرف قائم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ لوگ غیر سدید قول اپنی زبان سے نکالیں تو سارا معاملہ بالکل الٹا ہو جائے گا۔ اب کہنے والے کے اندر منفی مزاج پرورش پائے گا۔ وہ دہرا شخصیت کا انسان بن جائے گا۔ ذاتی معاملات کے لئے اس کی سوچ کچھ ہوگی اور دوسروں کے معاملات کے لئے اس کی سوچ کچھ۔ اس کے اندر سازشی ذہنیت بنے گی۔ اس کا سینہ جھوٹے افکار کی تخلیق کا کارخانہ بن جائے گا۔ اور جب فرد کے اندر ایسا ہوگا تو پورا معاشرہ بھی اسی ڈھنگ پر بننا شروع ہو جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہر طرف منافقت کی فضا پیدا ہوگی۔ انصاف پسندی کے بجائے تعصب اور حقیقت بیانی کے بجائے غیر سنجیدہ کلام کا عام رواج ہو جائے گا جو آخر کار پورے معاشرہ کو فاسد معاشرہ بنا دے گا۔

سدید کلام اور غیر سدید کلام کی ایک مثال وہ ہے جو زید بن حارثہ کے واقعہ کے ذیل میں سامنے آئی۔ زید بن حارثہ کی حیثیت مدینہ میں غلام کی تھی، اور زینب بنت جحش بنو ہاشم کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان نکاح کر دیا۔ مگر مذکورہ فرق کی بنا پر دونوں میں نباہ نہ ہو سکا اور آخر کار طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب سے نکاح فرمالیا۔

اس واقعہ کو بتانے کے لئے "قول سدید" کا انداز یہ تھا کہ یہ کہا جائے کہ زینب جو کہ مطلقہ ہو چکی تھیں، ان سے عدت گزرنے کے بعد پیغمبر اسلام نے نکاح کر لیا اور ان کو شرعی طور پر اپنی ازواج میں شامل کر لیا۔ مگر مدینہ کے منافقین نے اس واقعہ کو غیر سدید انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ پیغمبر اسلام کو زینب پسند آگئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے تدبیر کر کے ان کو طلاق دلوایا اور پھر پیشگی منصوبہ کے مطابق خود ان سے نکاح کر لیا۔

مدینہ کے منافقین نے اس واقعہ کو جس طرح پیش کیا وہ ایک صحیح واقعہ کو غلط شکل میں بیان کرنا ہے۔ یہ غیر سدید کلام اپنی زبان سے نکالنا ہے۔ اور غیر سدید کلام اپنی زبان سے نکالنا بلاشبہ بہت بڑا جرم ہے۔ ایسا ایک کلام آدمی کے تمام اعمال کو حبط کر سکتا ہے۔ اس سے آدمی کی اپنی روح بھی گندی ہوتی ہے اور اگر ایسی بات سماج میں پھیل جائے تو وہ سماج کو بھی فساد اور بگاڑ کی طرف لے جانے کا سبب بن جائے گی۔

قول سدید (الاحزاب ۷۰) کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک اور مثال لیجئے۔ ابو الفدا الحافظ ابن کثیر نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے:

قد روی عن الحسن البصری انہ کان ینقم علی معاویۃ اربعۃ اشیاء۔ قتالہ علیاً وقتلہ حجر بن عدی واستلحاقہ زیاد بن ابیہ ومبایعتہ لیزید ابنہ (البدایۃ والنہایۃ ۸/۱۳۰)

حسن بصری کے بارہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ چار چیزوں کے لئے معاویہ پر سخت کراہت کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا علی سے لڑنا، ان کا حُجر بن عدی صحابی کو قتل کرنا، ان کا زیاد بن ابیہ کو اپنے نسب میں ملانا، اور ان کا اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت لینا

اس واقعہ کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہے کہ اس کو بتانے کے لئے وہی الفاظ بولے جائیں جو

ابن کثیر نے نقل کئے ہیں۔ یعنی یہ کہا جائے کہ امام حسن بصری نے امیر معاویہ رضؓ کی چار باتوں سے عدم اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ یہ قول سدید کا انداز ہے۔ اگر ایسا کہا جائے تو اس سے کسی قسم کی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔

اس کے برعکس دوسرا انداز یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ "حسن بصری صحابۂ کرام پر جارحانہ تنقید کرتے تھے"۔ یہ دوسرا کلام غیر سدید قول کی مثال ہے۔ کیوں کہ وہ ایک واقعہ کی تعمیم ہے۔ وہ ایک سادہ بات کو سنگین بات بنا کر پیش کرتا ہے۔ ایسا قول خود کہنے والے کے لئے بھی جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور سننے والوں کے اندر بھی وہ غلط اثرات پیدا کرنے والا ہے۔

دونوں جملوں میں بظاہر صرف چند الفاظ کا فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ حتی کہ ایک جملہ بولنا پوری طرح جائز ہے، اور دوسرا جملہ بولنا پوری طرح ناجائز۔

آدمی کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی پوری شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ مذکورہ دونوں جملوں کا ہے۔ پہلا جملہ سنجیدہ ذہن کا پتہ دیتا ہے اور دوسرا جملہ غیر سنجیدہ ذہن کا۔ پہلے جملہ میں احتیاط کی نفسیات جھلکتی ہے اور دوسرے جملہ میں بے احتیاطی کی نفسیات۔ پہلے جملہ میں معاملہ کو جیسا ہے ویسا ہی بیان کیا گیا ہے اور دوسرے جملہ میں اس کو خود ساختہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلا جملہ حقیقت پر مبنی کلام ہے اور دوسرا جملہ حقیقت سے ہٹا ہوا کلام۔

پہلا جملہ خدا سے ڈرنے والے انسان کا کلام ہے اور دوسرا جملہ خدا سے نہ ڈرنے والے انسان کا کلام۔ پہلا جملہ منصفانہ قول کا نمونہ ہے اور دوسرا جملہ ظالمانہ قول کا نمونہ۔ پہلا جملہ بولنا شرعی اعتبار سے کوئی جرم نہیں، مگر دوسرا جملہ بولنے والا یقینی طور پر شریعت کی نظر میں اپنے آپ کو مجرم ثابت کرتا ہے۔ حسن بصری نے تو کبھی ایسا نہیں کیا کہ وہ صحابۂ کرام کی جماعت پر جارحانہ تنقید کریں۔ انھوں نے صرف ایک صحابی کی بعض روش سے اظہار اختلاف کیا، جو ان کے نزدیک، دوسرے صحابہ کی روش سے ہٹی ہوئی تھی۔

مگر جب ایک شخص اس طرح کہے کہ "حسن بصری صحابۂ کرام پر جارحانہ تنقید کرتے ہیں۔" تو خود یہ کہنے والا یقینی طور پر "جارحانہ تنقید" کا مجرم بن گیا۔ کیوں کہ جو الزام مخاطب کے اوپر چسپاں نہ ہو وہ خود متکلم کی اپنی طرف لوٹ آتا ہے۔

ارکان اسلام

عن عبد اللّٰہ بن عمر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ بنی الاسلام علیٰ خمسٍ شہادۃِ أنْ لا الٰہ إلّا اللّٰہ و أنّ محمداً عبدُہ ورسولہ واِقام الصلاۃِ وایتاءِ الزکاۃِ والحجِّ وصومِ رمضانَ (متفق علیہ)

حضرت عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق، اسلام میں پانچ چیزیں ستون (pillars) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان بظاہر پانچ شکلی چیزوں کے نام ہیں۔ یعنی کلمۂ ایمان کے الفاظ کو دہرانا۔ صلاۃ کے ڈھانچہ کو قائم کرنا۔ زکوٰۃ کی مقررہ رقم نکالنا۔ حج کے مراسم کو ادا کرنا۔ رمضان کے صوم کا اہتمام کرنا۔ مگر اس کا مطلب شکل برائے شکل نہیں بلکہ شکل برائے اسپرٹ ہے۔ یعنی ان شکلی احکام کی ایک حقیقت ہے اور ان کی وہی ادائگی معتبر ہے جس میں اس کی حقیقت پائی جائے۔

اس دنیا میں ہر چیز کا معاملہ یہی ہے۔ مثلاً ٹیلیفون کو لیجئے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ٹیلیفون کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے۔ مگر یہی ظاہری صورت وہ چیز نہیں ہے جو اصلاً ٹیلیفون سے مطلوب ہو۔ ٹیلیفون برائے ٹیلیفون مطلوب نہیں ہوتا بلکہ ٹیلیفون برائے رابطہ مطلوب ہوتا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ میرے پاس ٹیلیفون ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ٹیلیفون کی صورت آپ کے پاس موجود ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ٹیلیفون کی حقیقت آپ کے پاس موجود ہے۔ یعنی ایک ایسی مشین جس کے ذریعہ دنیا کے ہر حصہ سے ربط قائم کیا جا سکے۔ جس کے ذریعہ دور کے لوگوں سے گفتگو کی جا سکے۔

یہی معاملہ اسلام کے مذکورہ پانچ ارکان کا بھی ہے۔ یہ ارکان اسی وقت ارکان اسلام ہیں جب کہ ان کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ ان کی شکل کے ساتھ ان کی معنوی روح بھی آدمی کے اندر پائی جا رہی ہو۔ روح کو جدا کرنے کے بعد شکل کا موجود ہونا ایسا ہی ہے جیسے اس کا موجود نہ ہونا۔

ایمان اسپرٹ ـــــــــ سب سے پہلا رکن ایمان ہے۔ اس کی ظاہری صورت کلمۂ اسلام کی زبان سے ادائگی ہے۔ اور اس کی معنوی اسپرٹ اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک انسان خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اعتراف کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اعتراف کرتا ہے کہ خدا نے ان کو پیغمبر کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ سچائی کے اعتراف کے لئے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لئے کوئی بھی چیز کبھی حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

صلاۃ اسپرٹ ـــــــــ صلاۃ کی ظاہری صورت پنج وقتہ عبادت ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ تواضع ہے۔ صلاۃ کا عمل کرنے والا آدمی اپنے رب کے آگے جھکتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر تواضع کی نفسیات پیدا کرتا ہے۔ جس آدمی کے اندر صلاۃ اسپرٹ پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا نہ کہ فخر اور کبر کا رویہ۔

زکاۃ اسپرٹ ـــــــــ زکاۃ کی ظاہری صورت سالانہ ایک مخصوص رقم کی ادائگی ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ خدمت ہے۔ جو آدمی زکاۃ کا عمل کرے اس کے اندر خلق کے لئے خدمت اور خیر خواہی کا عمومی جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ چاہے گا کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکے۔

حج اسپرٹ ـــــــــ حج اپنے ظاہر کے اعتبار سے سالانہ مراسم کی ادائگی ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ اتحاد ہے۔ جو آدمی صحیح کیفیت کے ساتھ حج کے فرائض ادا کرلے اس کے اندر اختلافی نفسیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے مزاج کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ دوسروں کے ساتھ اس کا اختلاف پیش آگیا ہو۔

صوم اسپرٹ ـــــــــ صوم کی ظاہری صورت رمضان کے مہینہ کا روزہ ہے اور اس کی معنوی اسپرٹ صبر ہے۔ صوم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر صبر کی اسپرٹ پیدا ہو۔ جو آدمی صوم کا عامل ہو، اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناخوشگوار باتوں کو برداشت

کرے، وہ لوگوں کی قابل شکایت باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی گزارے۔

جو لوگ اسلام کے ان پانچ ارکان کو محض ان کی شکل کے اعتبار سے اختیار کریں، وہ مخصوص شکل کی حد تک تو ان کو اپنائیں گے، مگر ان شکلوں کے باہر ان کی زندگی ان ارکان سے بالکل آزاد اور غیر متعلق ہوگی۔

مثلاً وہ کلمۂ ایمان کے الفاظ کو اپنی زبان سے دہرائیں گے، مگر ان مخصوص الفاظ کے باہر جب ان کے سامنے کوئی حق آئے گا تو وہ اس کا اعتراف نہ کر سکیں گے۔ کیوں کہ ان کی روح کلمہ کی اسپرٹ سے خالی ہے۔ وہ نماز کی شکل کو مسجد میں کھڑے ہو کر دہرائیں گے۔ مگر مسجد کے باہر جب لوگوں کے ساتھ ان کا سابقہ پیش آئے گا تو وہاں وہ تواضع کا انداز اختیار نہ کر سکیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوگی نماز کی جو اسپرٹ ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں۔

اسی طرح وہ زکوٰۃ کے نام پر ایک رقم نکال کر کسی کو دیدیں گے۔ مگر اس کے بعد جب وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کریں گے تو اس میں وہ خیر خواہی کا ثبوت نہ دے سکیں گے۔ کیوں کہ زکاۃ اسپرٹ سے ان کا سینہ خالی تھا۔ وہ اہتمام کے ساتھ حج کا سفر کریں گے اور اس کے مراسم ادا کر کے واپس آجائیں گے۔ مگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں گے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا معاملہ کریں۔ کیوں کہ انھوں نے حج کے باوجود حج اسپرٹ اپنے اندر پیدا نہیں کی۔ رمضان کا مہینہ آئے گا تو وہ موسمی عبادت کے طور پر ایک مہینہ کا روزہ رکھ لیں گے۔ مگر وہ صبر کے موقع پر صبر نہیں کریں گے۔ وہ ہر اشتعال پر مشتعل ہو کر لڑنے لگیں گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ظاہری طور پر انھوں نے روزہ تو رکھ لیا، مگر ان کے دل و دماغ میں روزہ کی اسپرٹ پیدا نہ ہو سکی۔

جو آدمی اسلام کے پانچ ارکان کو اختیار کرلے وہ مومن و مسلم ہو گیا۔ وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ دنیا میں اس کو اللہ کی رحمت ملے اور آخرت میں اس کو جنت میں داخل کیا جائے۔ مگر اسلام کے پانچ ارکان اپنی شکل اور روح دونوں کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ ان کی ادائگی پر جن انعامات کا وعدہ ہے اس کا تعلق کامل ادائگی پر ہے نہ کہ ادھوری ادائگی پر۔

اسلام کے بارہ میں اس غلط فہمی کی ذمہ داری تمام تر نااہل مسلم رہنماؤں پر ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے قومی مسائل کو دی۔ چنانچہ جو قومیں انھیں ان کے قومی حوصلوں میں رکاوٹ نظر آئیں، وہ ان کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہو گئے۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اینٹی امریکن ازم، یا اینٹی ویسٹرن ازم کے ہم معنی بن گیا۔ اگر یہ رہنما دوسرے انسانوں کی نجات آخرت کے لئے تڑپتے تو وہ دوسرے انسانوں کے سامنے واللہ یدعوا الی دارالسلام (یونس ۲۵) کا پیغام لے کر کھڑے ہوتے۔ یہ چیز انھیں دوسری قوموں کا خیر خواہ بناتی۔ دوسری قومیں ان کے لئے محبت کا موضوع بن جاتیں۔ اور پھر لوگوں کو نظر آتا کہ اسلام ہمارا موافق مذہب ہے نہ کہ ہمارا مخالف مذہب۔

یہ بلاشبہ اسلام کے حق میں سب سے بڑا نقصان ہے۔ اور اسلام کو یہ نقصان اس کے دشمنوں نے نہیں پہنچایا بلکہ اسلام کے نادان دوستوں نے اسلام کو یہ سب سے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

امریکہ کے شہر پلین فیلڈ (Plainfield) سے ایک میگزین نکلتا ہے۔ اس کا نام اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) ہے۔ اس کا شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۰ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر " انڈین مسلم ریلیف کمیٹی " کا اشتہار تھا۔ اس میں اپیل کی گئی تھی کہ فلاں پتہ پر اپنے عطیات (donations) روانہ کریں۔ اس اشتہار میں یہ الفاظ درج تھے کہ چوں کہ ہندستان کے مسلمان کہتے ہیں کہ صرف اللہ ہمارا رب ہے، اس لئے بے رحمانہ اور وحشیانہ ظلم ان پر ٹوٹ پڑا ہے، مکمل گرہن کی مانند :

Because Muslims in India say, "Allah is our Lord," ruthless and brutal oppression has come upon them like a full eclipse.

یہ الفاظ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہیں بلکہ وہ قرآن و حدیث کی نفی کے ہم معنی ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد ۲۰۰ ملین بتائی جاتی ہے۔ یہ تعداد دور اول کے صحابہ و تابعین کی مجموعی تعداد سے بھی بہت زیادہ ہے۔ اگر واقعۃً مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو صرف اس لئے وحشیانہ طور پر ستایا جائے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتے ہیں تو ناممکن ہے کہ کوئی ستانے

والا ان کو ستانے میں کامیاب ہو۔ ایسی صورت میں یقیناً اللہ کی غیرت جوش میں آئے گی اور پھر ظالموں کو زیر کر دیا جائے گا اور حق کی خاطر مظلوم ہوجانے والوں کو غلبہ عطا ہوگا۔

کیسے بے خبر ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ظلم کو جانیں مگر وہ خالق کے انصاف کو نہ جانیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو انسان کی طاقت کو جانیں مگر وہ خداوند ذو الجلال کی طاقت سے بے خبر بنے ہوئے ہوں۔

صغیر اسلم صاحب کی یہاں کپڑے کی ایک بڑی دکان (اسٹور) ہے۔ اس میں کپڑے کو رکھنے کے لئے انھیں خاص طرح کی الماریوں کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بڑھئی (Bobbie) ان کی دکان میں کام کر رہا تھا۔ ۲۹ نومبر کی شام کو میں ان کے اسٹور میں گیا۔ میں نے بڑھئی کو کام کرتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا: امریکی بڑھئی ہونا ایک ایڈوانچ ہے۔

ہر قسم کی تیار شدہ لکڑی، ہر قسم کا عمدہ لوہے کا سامان، ان کو کاٹنے اور جوڑنے کے لئے ہر قسم کی دستی مشین۔ اسکریوگن (screw gun) وغیرہ بڑھئی کے پاس موجود تھیں۔ وہ ان کے ذریعہ اس طرح فینسی الماریاں بنا رہا تھا جیسے کہ یہ کوئی خشک کام نہ ہو بلکہ ایک تفریحی عمل ہو۔ ترقی یافتہ ملکوں میں شراب اور جنسی آزادی جیسی خرابیاں بہت افسوسناک ہیں۔ مگر ٹکنیک کے اعتبار سے ان ملکوں میں اور ہندستان جیسے ملکوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں ہم لوگ ابھی پتھر کے دور میں رہ رہے ہیں۔

ہندستان میں بے شمار تحریکیں ہیں جو تخریب کے کارنامے انجام دے رہی ہیں۔ مگر کوئی ایک بھی ایسی تحریک نہیں جو حقیقی معنوں میں تعمیری مقاصد کے لئے سرگرم ہو، جو ملک کو آگے لے جانے کی کوشش کرے۔ تحریکوں کے ہجوم میں تحریک کے فقدان کی یہ کیسی عجیب مثال ہے جو ہندستان میں پائی جاتی ہے۔

یہ ایک جدید طرز کا اسٹور تھا۔ یہاں میز پر نہایت شاندار چھپے ہوئے بہت سے کیٹلاگ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ملبوس مردوں اور عورتوں کی رنگین تصویروں کے ذریعہ کپڑوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ایک صفحہ پر کپڑوں کی نمائش کرتے ہوئے یہ الفاظ درج تھے ـــــ سنسنی خیز، تمام نگاہیں تمہارے اوپر:

Sensational... all eyes on you.

عام لوگ پرکشش کپڑے پہن کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ لیڈروں کا طبقہ بھی یہی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ خوشنما کپڑوں کے ذریعہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں قابل توجہ بناتے ہیں اور لیڈر لوگ خوشنما تقریروں کے ذریعہ۔

مردوں اور عورتوں کے ایک مشترک اجتماع میں خطاب کا موقع ملا۔ خطاب کے بعد کچھ سوالات سامنے۔ ایک خاتون کی طرف سے ایک تحریری سوال آیا، اس کا خلاصہ یہ تھا: جب کسی کے برے سلوک سے دل کو سخت رنج پہنچتا ہے تو اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

میں نے سوچا کہ اس سوال کا جواب تو قرآن وحدیث میں انتہائی واضح ہے۔ قرآن وحدیث میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر معافی اور درگذر سے کام لو، تم اگر بندوں سے درگذر کرو تو خدا قیامت کے دن تم سے درگذر کا معاملہ فرمائے گا۔ ان واضح ہدایات کے باوجود کیوں ایک دیندار اور تعلیم یافتہ خاتون ایسا سوال پوچھ رہی ہیں۔

میری سمجھ میں آیا کہ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ ان لیڈروں نے موجودہ زمانہ میں جو سب سے بڑی دھوم مچائی وہ غیر اقوام کے "برے سلوک" پر فریاد واحتجاج کا مظاہرہ تھا۔ اسی قسم کی سطحی تقریروں اور تحریروں پر انھوں نے پوری قوم کو اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن وحدیث کی مذکورہ تعلیم پوری قوم کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ مسلمانوں کو صرف یہ سکھایا گیا کہ تمھیں اشتعال انگیزی پر مشتعل ہونا ہے۔ رنج کا تجربہ ہونے پر تم کو شدت کے ساتھ اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرنا ہے۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ قوم کے افراد قرآن کی ان تعلیمات کی اہمیت کو سمجھیں جن میں عفو ودرگذر اور صبر واعراض کی تلقین کی گئی ہے۔

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۳۰ نومبر ۱۹۹۰) کے پہلے صفحہ پر یہ سنسنی خیز خبر تھی ـــــ صدام حسین کو کویت سے نکل جانے کے لئے صرف ۴۷ دن:

Saddam has 47 days to get out

اقوام متحدہ کی سیکوریٹی کونسل نے تقریباً متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک بلا شرط کویت کا علاقہ خالی کر دیں، ورنہ امریکہ کو حق ہوگا کہ وہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کرے۔

اس خبر کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہی معاملہ ہر انسان کا ہے، حتی کہ خود مذکورہ الٹی میٹم دینے والوں کا بھی۔ ہر انسان جو اس دنیا میں اپنی زندگی بنا رہا ہے، اس کو خدا کی طرف سے قطعی آگاہی دے دی گئی ہے کہ تمہارے لئے صرف "۷۰ دن" کا موقع ہے۔ یا تو تم اس مدت میں اپنی سرکشی چھوڑ دو، ورنہ تم کو خدا کی دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارے لئے بربادی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہوگا۔ لوگ دوسروں کے خلاف الٹی میٹم دینے میں مشغول ہیں، خود اپنے خلاف الٹی میٹم کی کسی کو خبر نہیں۔

امریکہ میں "پیپر ردی والا" جیسی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی۔ کیونکہ یہاں اخباروں کو ردی میں بیچنے کا کوئی رواج نہیں۔ یہاں اخبارات کا واحد استعمال یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد انھیں کوڑے میں ڈال دیا جائے۔ جب کہ ہندستان میں آدمی اخبارات کو ردی میں بیچ کر ان کی تقریباً نصف لاگت واپس حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود امریکہ میں اخبارات اور میگزین نہایت عام ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ یہاں اخبار والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے اخبار کو پڑھیں۔ کیوں کہ ان کی قیمت تو انھیں ان کے مشتہرین ادا کر چکے ہوتے ہیں۔

یہاں میں روزانہ اخبار پڑھتا تھا۔ مگر پوری مدت میں یہاں کے اخبارات میں ہندستان کی کوئی خبر پڑھنے کو نہیں ملی۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملکوں کی خبریں تھیں۔ مگر ہندستان کی کوئی خبر نہیں۔ البتہ ہندستان میں کوئی بڑا فساد ہو جائے تو اس کی خبر ضرور یہاں کے اخباروں میں چھپتی ہے۔ اس طرح کی خبریں یہاں کے لوگوں کو یہ تسکین فراہم کرتی ہیں کہ صرف ہمارا سماج مہذب سماج ہے۔ بقیہ دنیا میں وحشت و بربریت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندستان کی انتہا پسند تحریکیں صرف ملک دشمنی کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسی خبریں تخلیق کرنے میں مشغول ہیں جن کا دوسری قوموں کو نہایت شدت کے ساتھ

انتظار ہے۔

۲۹ نومبر کو دوپہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے یہاں کی گھڑی میں دیکھا تو وہ ساڑھے گیارہ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کے بعد میری نظر اپنے ہاتھ کی گھڑی پر گئی تو اس میں ایک بجے کا وقت تھا۔ ایک لمحہ کے لئے یہ فرق عجیب لگا۔ پھر خیال آیا کہ میری گھڑی میں دہلی کا وقت ہے۔ اور کیلی فورنیا اور دہلی کے وقت میں ساڑھے دس گھنٹہ کا فرق پایا جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ میں کیلی فورنیا میں ساڑھے گیارہ بجے دن کی روشنی میں بیٹھا ہوا ہوں، دہلی کے لوگ ایک بجے رات کے اندھیرے میں اپنے گھروں کے اندر سو رہے ہوں گے۔ کیلی فورنیا میں آج ۲۹ نومبر کی تاریخ ہے، مگر دہلی کا انسان اس وقت نومبر کی ۳۰ تاریخ میں داخل ہو چکا ہے۔ کیلی فورنیا میں اس وقت تمام سرگرمیاں اپنے شباب پر ہیں، جب کہ دہلی میں تمام انسانی سرگرمیاں رات کے سناٹے میں روپوش ہو چکی ہیں۔

زمین کی سطح پر رات اور دن کا یہ فرق سورج کے سامنے زمین کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ خلائے بسیط میں زمین کی یہ گردش اتنی حیران کن ہے کہ اس کے بارہ میں سوچ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آدمی بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔

انوار حسن صاحب (۵۴ سال) ایک امریکی کمپنی (GHG) میں کام کرتے ہیں۔ اتوار کے دن وہ رضاکارانہ طور پر ایک اسلامک سنٹر میں "سیکورٹی" کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ اتوار کے دن اس سنٹر میں کافی مسلمان آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے جو مسلمان یہاں آتے ہیں، وہ امریکیوں کے درمیان تو بہت بااصول طور پر رہتے ہیں۔ "سر" کہے بغیر ان سے بات نہیں کرتے۔ مگر جب وہ اسلامک سنٹر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی جنگل میں آگئے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے کہا کہ مثال کے طور پر جب وہ امریکی دفتروں میں جاتے ہیں تو وہاں وہ گاڑیوں کے قوانین کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ مگر اسلامک سنٹر میں آتے ہی ان کا انداز بدل جاتا ہے۔ پچھلے سنڈے کو میں سنٹر کے گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک مسلمان اپنی مرسیڈیز پر آئے اور نکلنے والے دروازہ (exist)

سے داخل ہونے لگے۔ میں نے روکا تو مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اگر یہ بیان صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ موجودہ مسلمان (کم از کم ان کی اکثریت) اصول کے تحت باقاعدگی اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ صرف ڈر کے تحت باقاعدہ بننا جانتی ہے۔

امریکہ کے مختلف شہروں میں اس وقت اسلامک سنٹر کے نام سے ایک ہزار سے زیادہ ادارے قائم ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد میری رائے یہ ہے کہ عملی حالت کے اعتبار سے یہ ادارے مسلم کلچرل سنٹر ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامک سنٹر۔ یہ مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی ضرورت کا اظہار ہیں نہ کہ اسلام کے اصولی اور دعوتی تقاضے کا اظہار۔

امریکہ کے شہروں میں آپ کو بس اور ٹرام اور ریلوے دکھائی نہیں دیں گی۔ اس کے برعکس ان سڑکوں پر ہر وقت کاروں کا مشینی سیلاب بہتا رہتا ہے۔ بظاہر یہ ترقی کی علامت ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا یہ سرمایہ دارانہ استحصال ہے۔ یہاں کے سرمایہ دار منظم طور پر یہ کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام قائم نہ ہونے پائے تاکہ ان کی کاریں زیادہ سے زیادہ فروخت ہوں۔ یہاں رہنے والا ایک شخص نہایت آسانی سے قسط وار ادائگی کی بنیاد پر ایک یا زیادہ کار خرید سکتا ہے۔ اور اسی طرح دوسری تمام چیزیں بھی۔ اس طرح یہاں کا تقریباً ہر آدمی اپنی کمائی کا بہترین حصہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اکاونٹ میں پہنچاتا ہے، سامان کی ادھار خریداری کی صورت میں، نیز اس کے اوپر مستقل سود کی ادائگی کے ذریعہ۔

قرض پر مبنی اس اقتصادیات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ لوگوں کے پاس دین کی مدیں دینے کے لئے بہت کم رقم باقی رہتی ہے۔ بظاہر یہاں کا ہر مسلمان کافی کمار ہا ہے مگر دین کی مدوں میں تعاون دینے کے لئے وہ اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے۔

۲ دسمبر کو سین گیبریل (San Gabril Valley) کے اسلامک سنٹر میں تقریر کا پروگرام تھا۔ جناب عبد القادر النجار کے ساتھ یہ سفر طے ہوا۔ موصوف کا خاندان طائف سے آکر حلب (شام) میں آباد ہو گیا۔ ۳۷ سال پہلے وہ حلب سے امریکہ آگئے۔ اب وہ یہاں کے شہری ہو چکے ہیں۔ وہ پرجوش حد تک دین پسند آدمی ہیں۔ چلتے اور آتے ہوئے مجموعی طور پر ۷۰

کیلومیٹر کا راستہ ان کے ساتھ گزرا۔

انھوں نے ایک واقعہ کے بارہ میں بتاتے ہوئے کہا: قل الحق ولو علیٰ نفسك (حق بات کہو، خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ ہو)۔ ایک اور واقعہ کے ذیل میں انھوں نے کہا: ان اللّٰہ یُمْہِلُ ولا یُہْمِلُ (اللہ مہلت دیتا ہے مگر اللہ کبھی چھوڑتا نہیں)

روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (۴ دسمبر ۱۹۹۰) میں صفحہ اول پر ایک باتصویر خبر ہے۔ تصویر میں ایک جہاز (DC-9) ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ اس کو شعلے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ہوائی حادثہ کا قصہ ہے جو امریکہ کی ریاست مشی گان میں ڈیرائٹ کے ہوائی اڈہ پر پیش آیا۔ آٹھ مسافر فوراً مر گئے۔ بقیہ ۱۸۱ مسافروں میں کچھ زخمی ہوئے، اور کچھ پریشانی کی حالت میں باہر آئے۔

اس واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے اخبار نے لکھا تھا کہ یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ ایک جہاز (727) ایئر پورٹ کے کہر آلود رن وے (foggy runway) پر چلتے ہوئے دوسری طرف سے آنے والے جہاز کے راستہ میں داخل ہو گیا جو اڑنے والا تھا۔ اس کے بعد ایک جہاز کا پر دوسرے جہاز کے پر میں ٹکرا گیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ اس وقت ایئر پورٹ پر گہرا کہر چھایا ہوا تھا:

One Northwest Airlines jet strayed into the path of another that was streaming toward takeoff and the two collided in heavy fog on a runway at Detroit Metropolitan Airport.

اس خبر کو پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ "کہر" کا مسئلہ ہر سفر میں پیش آتا ہے، خواہ وہ مادی سفر ہو یا کوئی ذہنی سفر۔ آدمی اگر صرف روشن راہوں میں چلنا جانتا ہو، وہ کہر کے راستوں میں چلنے کے آداب نہ جانتا ہو تو اس کا یہی انجام ہوگا کہ وہ مخالف سمت سے آنے والی کسی "سواری" سے ٹکرا جائے گا۔ ایسا آدمی اپنی آخری منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔

۶ دسمبر کو جب کہ کیلی فورنیا میں صبح سویرے کا وقت تھا اور دہلی میں شام کا، مجھے دہلی سے بات کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کہا۔ انھوں نے

اپنے ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں کے بٹن دبائیے:

011-91-11-611128

اس کے فوراً بعد دہلی میں ہمارے دفتر میں گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سوچا کہ جس دنیا میں یہ ممکن ہے کہ کیلی فورنیا کا ایک انسان دہلی کے ایک انسان سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں رابطہ قائم کر لے، اس دنیا میں کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے خالق سے رابطہ قائم کر سکے۔ دل نے کہا کہ یقینی طور پر ممکن ہے۔ مگر اس کے لئے اسی طرح صحیح تدبیر اختیار اختیار کرنی ہوگی جو کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم کرنے کے لئے اختیار کی گئی۔ اس ربط کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ ہم مذکورہ نمبروں کا اہتمام نہ کرتے بلکہ دوسرے غیر متعلق نمبروں پر اپنی انگلیاں مارنے لگتے۔ ایسی حالت میں ہماری کوشش بے فائدہ ہو جاتی۔ اس کے بجائے ہم نے یہ کیا کہ صحیح ترین نمبر معلوم کر کے عین اسی نمبر کے ذریعہ ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایسا کرتے ہی فوراً ربط قائم ہو گیا۔

اسی طرح خدا سے ربط قائم کرنے کا بھی ایک "صحیح نمبر" ہے اور ایک "غلط نمبر"۔ جو شخص خدا سے ربط قائم کرنے کی سنجیدہ خواہش رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ پہلے اس کا "صحیح نمبر" معلوم کرے۔ ایسا کرنے کے بعد خدا سے اس کا ربط قائم ہونا اتنا ہی ممکن ہو جائے گا جتنا کیلی فورنیا اور دہلی کے درمیان ربط قائم ہونا۔ یہ صحیح نمبر اپنی ذات کو حذف کرنا ہے۔

جناب صفی قریشی صاحب نے ایک مجلس میں بہت اچھی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ آجکل مصنوعی سٹلائٹ خلا میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ سٹلائٹ اوپر جا کر ۲۰۰ میل یا اس سے کم و بیش کی دوری پر زمین کے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ مگر ان کی عمر کی ایک مدت ہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ زمین کی کشش کے دائرہ میں آ کر زمین کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیچے آتے آتے ایک روز زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح انسان ایک مقرر مدت کے لئے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کا واپسی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخرکار وہ دوبارہ خدا کی طرف چلا جاتا ہے۔

۶ دسمبر کو ظہر کی نماز کے بعد آخری بار میں یہاں کے پارک میں گیا۔ پارک کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ملی ہوئی سڑک سے ایک بہت بوڑھا امریکن جوڑا خاص طرح کی کھلی ہوئی چھوٹی گاڑی کو آہستہ

چلاتا ہوا گزر رہا ہے۔ میری نظر ان لوگوں کی طرف گئی تو مرد نے ہاتھ اٹھا کر ہائی (ہیلو) کہا۔ میں پارک کے اندر داخل ہو رہا تھا اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس واقعہ میں مجھے خود اپنا ودائی سفر دکھائی دینے لگا۔ میں نے کہا: کل مجھے یہاں سے جانا ہے اسی طرح ایک اور کل آئے گا جب کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پہلے سفر کی منزل معلوم ہے، مگر دوسرے سفر کی منزل معلوم نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے سفر میں میرے اوپر کیا بیتنے والا ہے۔

کچھ دیر تک میں پارک میں بیٹھا۔ خوبصورت پارک، سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے مکانات، ہوا کے خوشگوار جھونکے، سڑک پر پھسلتی ہوئی کاریں، سورج کی سنہری روشنی میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز، اس طرح کے مختلف مناظر کے درمیان میں نے سوچا کہ خدا نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں۔ لوگ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں جو ان بے پایاں نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا: خدایا، میں ساری انسانیت کی طرف سے تیرا شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان کے اوپر تیرا غضب نازل نہ ہو جائے۔

۴ دسمبر کو ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی صاحب کے ساتھ لاس اینجلیز گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں چند گھنٹے گزرے۔ امریکی فوج کے تحت کیلی فورنیا میں ایک نشریاتی ادارہ (Armed Forces Radio & Television Broadcast Centre) عرصہ سے قائم ہے۔ اس کے نمائندہ کے طور پر مسٹر رچرڈ ڈیون پورٹ (Richard Davenport) وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ادارہ مختلف قسم کے ویڈیو کیسٹ تیار کرتا ہے جو امریکی فوج کے لئے ٹیلیوژن پر دکھایا جاتا ہے۔ یہ پروگرام امریکہ کی تمام فوجی تنصیبات (bases) پر دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت امریکہ کی تقریباً چار لاکھ فوج خلیج عرب کے علاقہ میں ہے۔ مزید فوج بھی وہاں بھیجی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امریکی فوجی اسلام اور عرب کلچر کے بارہ میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز یہ

برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا
چاہتے ہیں :

> The one good thing that came out of this armed forces presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

یہاں پر اسلامک انفارمیشن سروس کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ وہ ہر ہفتہ ایک ویڈیو ٹیپ تیار کر کے ٹیلیویژن کمپنی کو دیتا ہے اور اس کو ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے۔ مجھ سے انھوں نے ویڈیو پر ایک مفصل انٹرویو لیا۔ اس میں اسلام کے موجودہ مسائل اور امریکی مسلمان اور ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں سوالات تھے۔ میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں ملک میں لینے والے گروہ (taker-group) بن گئے۔ ان کی حیثیت دینے والے گروہ (giver-group) کی نہیں۔ ان کے مسئلہ کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ انھیں دوبارہ دینے والے گروہ کے مقام پر لایا جائے۔

مسٹر اسلم عبد اللہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ محمد مسلم صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ یہاں وہ انگریزی میگزین (The Minaret) کے اڈیٹر ہیں۔ انھوں نے جو باتیں کہیں، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندستانی مسلمانوں کے لئے صحیح ڈائرکشن یہ ہے کہ وہ کنفرنٹیشن کو اوائڈ کرتے ہوئے کام کریں۔"

۵ دسمبر کی شام کو اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی کے ہال میں ایک اجتماع میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہ مسلم، مسیحی اور یہودی سمینار (Trialogue) تھا۔ پہلے ایک یہودی عالم نے تقریر کی اور اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ایک عیسائی عالم کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے مذہب کے بارہ میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی) کھڑے ہوئے، انھوں نے اسلام کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیت عطا کی ہے۔ انھوں نے اسلام کا تعارف

کرایا تو ان کی تقریر پچھلی دونوں تقریروں پر بھاری ہوگئی۔ لوگوں نے نہایت پسند کیا۔ میرے قریب کی سیٹوں پر چند امریکی نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ Comparative religion (تقابلی مذہب) کے طلبہ تھے۔ وہ اگرچہ مسیحی تھے اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر سننے کے بعد ایک نوجوان بے اختیار کہہ اٹھا کہ میں مسیحی ہوں۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر نے مجھے اپنے عقیدہ کے بارہ میں شک میں ڈال دیا ہے اور میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے اسلام کے بارہ میں اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ واقعۃً غیر معمولی قسم کے لائق آدمی ہیں:

I am a Christian. But Dr. Siddiqi's presentation make me think twice. I have to learn more about Islam. He was terrific real genius.

ڈاکٹر صدیقی نے اپنی تقریر میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا تعارف کراتے ہوئے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ اگرچہ تمام مذاہب خدا کی طرف سے آئے۔ مگر آج تمام مذاہب میں محفوظ مذہب (Preserved religion) صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ یہی اسلام کو پیش کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اسلامی دعوت میں ہمیں فروعی یا سیاسی باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف بنیادی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی ترجیح بتانے کے لئے یہ نہیں کہنا ہے کہ اسلام افضل مذہب ہے۔ ہمیں ترجیح بتانے کے لئے صرف ایک بات کہنا ہے اور وہ یہ کہ اسلام ہی آج محفوظ مذہب ہے۔ دوسرے مذاہب تاریخی اعتبار سے محفوظ مذہب نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر صدیقی جیسے افراد کی رہنمائی میں اس قسم کی سنجیدہ کانفرنسیں یورپ اور امریکہ میں کی جائیں تو ان کے ذریعہ زبردست دعوتی فائدہ حاصل ہوگا۔ پروگرام کے مطابق آخر میں اختتامی کلمات مجھے کہنا تھا۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعض وجوہ سے میں آخر وقت تک ٹھہر نہ سکا۔ میں خاتمہ سے پہلے چلا آیا۔

نیو یارک سے جناب کلیم الدین صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے یہ خوشی کی بات بتائی

کہ وہ وہاں الرسالہ مشن کو پھیلا رہے ہیں۔ ۴ دسمبر کی شام کو دوبارہ نیویارک سے جناب محمد ابراہیم صاحب (۴۲ سال) کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کمپیوٹر انجینئر ہیں اور ۱۸ سال سے نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ ۱۹۸۹ میں حج کے لئے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے دعا کی کہ خدایا، مجھے دین کا علم عطا فرما۔ واپسی پر ان کی ملاقات کلیم الدین صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے محمد ابراہیم صاحب کو الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ الرسالہ کو پڑھتے ہی انھیں محسوس ہوا کہ ان کی دعا قبول ہوگئی۔ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کی صورت میں انھوں نے اس علم دین کو پالیا جو ان کی روح طلب کر رہی تھی۔ اب دونوں مل کر نیویارک میں الرسالہ مشن کا کام کر رہے ہیں۔

میرے نزدیک مغربی دنیا میں سب سے بڑا اسلامی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی زبان میں صحیح اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ یہاں میں نے ۵۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دیکھی۔ وہ خاص طور پر غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کے لئے چھاپی گئی ہے۔ اس کا نام تھا:

Introducing Islam to non-Muslims

اس کتاب میں جہاد کے عنوان کے تحت کہا گیا تھا کہ جہاد مقدس جنگ (Holy War) نہیں ہے۔ مقدس جنگ کا تصور ایک مسیحی تصور ہے۔ اس کے بعد جہاد کی تشریح کرتے ہوئے درج تھا کہ جہاد صرف دفاعی جنگ بھی نہیں۔ بلکہ وہ کسی بھی غیر منصفانہ حکومت کے خلاف جنگ کا نام ہے۔ اگر ایسی حکومت موجود ہے تو اس کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ یہ جنگ لیڈروں کے خلاف ہوگی نہ کہ ملک کے عوام کے خلاف۔ عوام کو نامنصفانہ حکومت کے قبضہ سے نکالا جائے گا تاکہ وہ آزادانہ طور پر اللہ پر ایمان لا سکیں:

> *Jihad* is not also a defensive war only, but a war against any unjust regime. If such a regime exists, a war is to be waged against the leaders, but not against the people of that country. People should be freed from the unjust regimes and influences so that they can freely choose to believe in Allah.

(باقی آئندہ)

۱ سیرت رسول پر سادہ واقعاتی انداز کی ایک کتاب زیر تیاری ہے۔ یہ کتاب ہجرت تک لکھی جاچکی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی کتابت بھی ہو رہی ہے۔ ونگ کمانڈر یوسف خاں صاحب اس کا انگریزی ترجمہ کر رہے ہیں۔

۲ ڈاکٹر برن اسٹارف (Dr Dagmar Bernstorff) جرمنی کی ہیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ موصوفہ ۱۰ اپریل کو اسلامی مرکز میں آئیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں بات چیت کی۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ انگریزی کے کچھ شمارے انھوں نے پڑھے ہیں۔ اس کے مزید شمارے وہ اپنے ساتھ لے گئیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ مجھے بہت پسند ہے۔ چنانچہ میں نے اگست ۱۹۹۰ میں جرمنی کے ریڈیو پر اپنی جرمن تقریر میں الرسالہ کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ الرسالہ انڈیا کا واحد پرچہ ہے جو ہندستانی مسلمانوں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہا ہے۔ اس کا پیغام ہے کہ مسلمانوں کو ماضی کی گلوری میں گم رہنے کے بجائے اپنے مستقبل کی تعمیر میں سرگرم ہونا چاہئے۔

۳ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے رمضان کے مہینہ میں " سحرگاہی " کا پروگرام چلایا گیا۔ اس کے تحت ہر روز قرآن کی تلاوت اور اس کا ترجمہ سنایا جاتا تھا۔ اس موقع پر آل انڈیا ریڈیو کے عملہ نے تذکیر القرآن کا انتخاب کیا۔ چنانچہ تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ تذکیر القرآن سے سنایا جاتا رہا۔

۴ بھارتیہ شکشن منڈل (نئی دہلی) کے زیر اہتمام ۶ اپریل ۱۹۹۱ کو جھنڈے والان (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس سیمنار کا عنوان یہ تھا:

Constitutional rights to minorities and national integration

اس سیمنار میں صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور مقررین میں ان کا نام بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ مرکز کا کچھ ہندی لٹریچر انھیں بھیج دیا گیا۔

٥ ایک برطانی مسلمان کے خط سے معلوم ہوا کہ بی بی سی کے اردو شعبہ میں الرسالہ باقاعدہ طور پر پڑھا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

You will be pleased to know that Al-Risala is very popular in the Urdu section of the BBC. Next time I am there, I will ask Asif Jilani and Obaid Siddiqi, both of whom are avid readers of Al-Risala, if they are receiving their monthly copies. If you are in England sometime, perhaps you could inform me in advance so that an interview might be arranged for one of the Urdu programmes. (J.M. Butt)

٦ "اقوال حکمت" کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس وقت وہ چھپائی کے مرحلہ میں ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

٧ تذکیر القرآن کا ایک نیا اڈیشن تیار کیا جا رہا ہے۔ اس میں صرف عربی متن اور اردو ترجمہ ہوگا۔ پوری کتاب ایک جلد میں ہوگی۔

٨ الرسالہ کا ایک خاص نمبر زیر تیاری ہے۔ اس کا نام "رہنمائے حیات" ہوگا۔ اس کا ہر مضمون ایک صفحہ کا ہوگا۔ اس میں بتایا جائے گا کہ زندگی کی تعمیر کامیاب طور پر کس طرح کی جائے۔

٩ حافظ عبد الرزاق صاحب احمد آبادی تراویح سنانے کے لئے شکاگو (امریکہ) گئے۔ وہاں سے وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں : آپ نے تذکیر القرآن کے نام سے قرآن کا جو ترجمہ شائع کیا ہے، یہاں ایک مسجد میں اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اکثر لوگ اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں نے بھی مطالعہ کیا۔ بہت فرحت ہوئی، بہت آسان ہے۔

١٠ تذکیر القرآن کو آڈیو ٹیپ پر لایا جا رہا ہے۔ ایک جلد کی ریکارڈنگ ہو چکی ہے۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۴۵ کیسٹ پر پوری تذکیر القرآن آجائے گی۔

١١ مولانا عبد الرحیم رشادی (پالاپتی، تامل ناڈو) نے اطلاع دی ہے کہ انھوں نے "روشن مستقبل" کا ترجمہ تامل زبان میں مکمل کر لیا ہے اور اب اس کو چھاپنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اسی طرح وہ مرکز کی دوسری کتابیں بھی تامل زبان میں ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتے ہیں۔

١٢ "خلیج ڈائری" اردو میں الرسالہ مئی ١٩٩١ میں شائع ہوئی ہے۔ اب اس کا ترجمہ عربی، ہندی، انگریزی میں کیا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ وہ بقیہ تینوں زبانوں میں بھی شائع

کی جائے گی۔ ایک مقدمہ کا اضافہ ہوگا۔

13 داؤد آدم راوت صاحب (رائے گڑھ) لکھتے ہیں: آپ کی گراں قدر اور پراز معلومات کتاب عقلیات اسلام پڑھا۔ قرآن شریف کی حیرت انگیز معلومات سے آپ نے دنیا کو روشناس کیا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو۔

14 ۱۶ اپریل ۱۹۹۱ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا: عید — مسرتوں کا تیوہار۔

15 ایک کتاب "الربانیہ" کے نام سے تیار ہوئی ہے۔ یہ ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی وہ چھپائی کے لئے بھیج دی جائے گی۔

16 خبرنامہ کے تحت مشن کی جو خبریں آتی ہیں وہ اصل کام اور اصل سرگرمیوں سے بہت کم ہوتی ہیں۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مشن سے وابستہ حضرات جو کچھ کر رہے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں سے ہمیں بذریعہ ڈاک مطلع کرتے رہیں تاکہ ان کو خبرنامہ میں شامل کیا جاسکے۔

17 روشن مستقبل (الرسالہ جنوری ۱۹۹۱) کو ہر حلقہ میں کافی پسند کیا گیا۔ چنانچہ اصحابِ ایجنسی نے زیادہ تعداد میں منگوا کر اس کو پھیلایا۔ اب اس کو علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کے ساتھ کوئی مزید اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

18 الرسالہ فرینڈس سرکل، بمبئی کی جانب سے عنقریب بمبئی میں الرسالہ سمپوزیم منعقد کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات آئندہ شائع کی جائیں گی۔ مزید معلومات کے لئے درج ذیل پتہ پر ربط قائم کریں۔

DR ABDUL KARIM M NAIK
42 JAIL ROAD (E), CHAR NULL, DONGRI
BOMBAY 400009
TEL. 861572, 8519194

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ				
ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	۶۰ روپیہ	ایک سال	۲۵ ڈالر امریکی	۱۰ ڈالر امریکی
دو سال	۱۱۰ روپیہ	دو سال	۴۰ ، ،	۱۸ ، ،
تین سال	۱۵۰ روپیہ	تین سال	۵۵ ، ،	۲۵ ، ،
پانچ سال	۲۴۰ روپیہ	پانچ سال	۸۵ ، ،	۴۰ ، ،
خصوصی تعاون (سالانہ)	۲۰۰ روپیہ	خصوصی تعاون (سالانہ)	۱۰۰ ،	— —

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

شخصیاتِ اسلام

رجال امت کے ایمان افروز واقعات

جنوری ۱۹۹۲ کا الرسالہ انشاء اللہ خصوصی نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ اس کا عنوان "شخصیاتِ اسلام" ہوگا۔ اس میں تابعین کے دور سے لے کر اب تک کی اسلامی شخصیتوں کے ایمان افروز واقعات درج ہوں گے۔ صاحبان ایجنسی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیں تو پیشگی طور پر مطلع فرمائیں۔ (قیمت ۵ روپیہ)

RN 28822/76 □ August 1991 No. 177 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	75/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	25/-
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعمیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	15/-
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	30/-
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	6/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ حید الکلمات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسول	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 40/-
Muhammad	65/-
The Prophet of Revolution	
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad	
The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-
इन्सान अपने आपको पहचान	3/-
सच्चाई की तलाश	5/-
पैग़म्बरे-इस्लाम	3/-

Delhi Postal Regd No. D(SE)042
U(SE) 12/86

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

52